نبی اکرم
صلی اللہ علیہ وسلم
کا مقصدِ بعثت
ڈاکٹر اسرار احمد
مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

نام کتاب ——————— نبی اکرم ﷺ کا مقصدِ بعثت

باراول تا بارپنجم (۱۹۷۸ء تا ۲۰۰۱ء) ——————— ۲۷۵۰۰

بارششم (جنوری ۲۰۰۲ء) ——————— ۱۱۰۰

ناشر ——————— ناظم مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

مقام اشاعت ——————— ۳۶۔کے ماڈل ٹاؤن لاہور ۵۴۷۰۰

فون: ۳۔۵۸۶۹۵۰۱

مطبع ——————— شرکت پرنٹنگ پریس لاہور

قیمت (اشاعت خاص) ——————— ۳۶ روپے

نبی اکرم

صلی اللہ علیہ وسلم

کا مقصدِ بعثت

اور

انقلابِ نبویؐ کا اساسی منہاج

از

ڈاکٹر اسرار احمد

ترتیب

★ مقالۂ اولیٰ ★

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصدِ بعثت

★ مقالۂ ثانیہ ★

انقلابِ نبویؐ کا اساسی منہاج

تقدیم طبعِ اوّل

زیرِ نظر کتابچہ میرے دو مقالوں پر مشتمل ہے :-

پہلا مقالہ "نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلم کا مقصدِ بعثت: قرآن حکیم کی روشنی میں" مرکزی انجمن خدّام القرآن لاہور کی دوسری سالانہ قرآن کانفرنس کے پانچویں اجلاس میں پیش کیا گیا تھا جو جناح (ٹاؤن) ہال، لاہور میں ۲۶ مارچ ۱۹۷۵ء کی صبح کو منعقد ہوا حسنِ اتفاق سے اس روز ۱۲ ربیع الاوّل ۱۳۹۵ھ کی تاریخ تھی اور اس طرح مقالے کے موضوع کے ساتھ ایک حسین مناسبت پیدا ہو گئی۔ بعد ازاں یہ مقالہ دو قسطوں میں ماہنامہ 'میثاق' لاہور کی اکتوبر اور دسمبر ۷۵ء کی اشاعتوں میں شائع ہوا۔

دوسرا مقالہ "انقلابِ نبویؐ کا اساسی منہاج" تحریری صورت میں تو مارچ ۷۷ء میں 'شامِ ہمدرد' لاہور کی تقریب میں پیش کیا گیا تھا اور حسنِ اتفاق سے اس روز بھی قمری تاریخ ۱۲ ربیع الاوّل ۱۳۹۷ھ ہی تھی۔ البتہ اس عنوان سے ایک تقریر اوّلاً انجمن خدّام القرآن کی تیسری سالانہ قرآن کانفرنس کے آخری اجلاس ہی میں کی گئی تھی جو ۲۳ مارچ ۷۶ء کی شام کو جناح ہال لاہور میں منعقد ہوا تھا۔ بعد ازاں ایک جانب تو یہ مقالہ ماہنامہ 'میثاق' لاہور کی اشاعت بابت اپریل ۷۷ء میں شائع ہوا اور دوسری جانب اسے ایک صاحبِ خیر نے چھ ہزار کی تعداد میں طبع کرا کے مفت تقسیم کیا ——— اب یہ دونوں تحریریں یکجا پیشِ خدمت ہیں!

اللہ تعالیٰ اسے میرے حق میں بھی توشۂ آخرت بنائے اور اس کے ذریعے مسلمانوں کے دلوں میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مقصدِ بعثت کی عالمی سطح پر تکمیل کے لیے زندگیاں وقف کر دینے کی وہ "آرزو" پیدا فرمائے جس کے بارے میں علّامہ اقبال مرحوم نے بصد حسرت و یاس فرمایا تھا کہ: ؏

آرزو اوّل تو پیدا ہو نہیں سکتی کہیں اور ہو جائے تو مر جاتی ہے یا رہتی ہے خام!

اِس لیے کہ آنحضورؐ کے مقصدِ بعثت کی تکمیل کے لیے جان و مال کھپانا ہی آپؐ کے ساتھ "وفاداری" ہے اور یہ وہ مقام ہے جس کے بارے میں بالکل صحیح کہا تھا علّامہ مرحوم نے کہ:

کی محمدؐ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں

لاہور، ۱۷ اپریل ۷۸ء ——— خاکسار: اسرار احمد عفی عنہ

تقدیمِ طبع چہارم

الحمدُ لِلّٰہ کہ اس کتابچے کی چوتھی طباعت کے موقع پر نظرِ ثانی کی فرصت بھی میسّر آگئی، اور کتابت بھی از سرِ نو کرالی گئی ـــــــ گویا اب یہ کتابچہ ظاہری اور معنوی دونوں اعتبارات سے پہلے سے بہتر صورت میں پیش کیا جا رہا ہے۔

نظرِ ثانی کے دَوران بار بار قلب کی گہرائیوں سے اللہ تعالیٰ کے لیے تشکّر و امتنان کے جذبات پُوری شدّت کے ساتھ اُبھرے کہ اُس تعؔ نے محض اپنے فضل و کرم سے اب سے بارہ تیرہ سال قبل مجھ ایسے کم علم اور بے بضاعت انسان کے قلم سے یہ دُو مقالے تحریر کرا دیئے، جو نہ صرف یہ کہ سیرت نبوی علیٰ صاحبہا الصّلوٰۃ والسّلام کے صحیح فہم کے لیے بمنزلہ کلید ہیں، اس لیے کہ ان سے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ دُنیوی کی جدّوجہد کا اصل ہدف بھی معیّن ہو جاتا ہے اور آپؐ کا اساسی منہجِ عمل بھی واضح ہو جاتا ہے ـــــــ بلکہ ان تمام تحریکوں کی اہم ترین اور انتہائی اساسی عملی ضرورت کو بھی پُورا کرتے ہیں جو مختلف مسلمان ممالک میں احیاءِ اسلام اور غلبۂ دین کے عظیم مقصد کے لیے جدّوجہد کر رہی ہیں ـــــــ یعنی اوّلاً: اس امر کا واضح تعیّن کہ احیاءِ اسلام اور غلبۂ دین کی جدّوجہد اسلام کے نظامِ فکر و عمل میں کس مرتبہ و مقام کی حامل ہے؟ اور توحید، معاد اور رسالت کے اساسی نظریات و معتقدات کے ساتھ اِس کا علمی اور نظری ربط کیا ہے؟ اور ثانیاً ـــــــ اس امر کی وضاحت کہ اس عظیم جدّوجہد کا نقطۂ آغاز کیا ہے؟ اور اسلامی انقلاب کے مرحلۂ اولیٰ یعنی مردانِ کار کی تیاّری کے لیے دعوت، تزکیہ، اور تعلیم کا قرآنی اور نبویؐ منہاج کیا ہے؟۔

راقم الحروف کے واقفانِ حال اس حقیقت سے بخوبی واقف ہیں کہ انجمن خدّام القرآن، اور تنظیمِ اسلامی کی اکثر و بیشتر مطبوعات راقم کی ان تقاریر یا دروس پر مشتمل ہیں جنہیں

رفقاء و احباب (بالخصوص رفیق محترم شیخ جمیل الرحمٰن صاحب) نے ٹیپ سے اتار کر اپنے اپنے ذوق اور فہم کی مناسبت سے مرتّب کر کے شائع کر دیا ہے ـــــ اور گزشتہ بائیس سال کے عرصے میں براہِ راست راقم کے قلم سے نکلنے والی تحریروں کی تعداد بہت کم ہے ـــــ اس قدرِ قلیل' میں یہ دو[2] مقالے دین کے جَسَر کی تصوّر کی وضاحت اور تحریکِ اسلامی کی علمی و فکری اساس کی تعیین کے اعتبار سے سرِفہرست ہیں۔ (اور شاید یہی سبب ہے کہ اللہ تعالیٰ نے' راقم کے معمول اور عادت کے بالکل برعکس' اپنے خصوصی فضل و کرم سے ان پر پورے اہتمام کے ساتھ نظرِ ثانی کی ہمّت اور فرصت بھی عطا فرمادی، فَلِلّٰہِ الحَمدُ!)۔

ان میں سے مقالۂ اولیٰ یعنی "نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصدِ بعثت" دو[2] ابواب میں منقسم ہو گیا ہے' یعنی "بعثتِ انبیاءؑ کا اساسی مقصد" اور "بعثتِ محمدیؐ کی اِتمامی اور تکمیلی شان" ان میں سے پہلا باب چونکہ فلسفہ و حکمتِ دین کے بعض غامض اور دقیق مباحث پر مشتمل ہے، لہٰذا ایک عام قاری اسے قدرے مشکل اور ثقیل محسوس کرے گا، لیکن اگر ذرا ہمّت و محنت سے اس کے صُغریٰ و کُبریٰ کو ذہن نشین کر لیا جائے تو اِن شاء اللہ العزیز کارکنوں کی دعوتی اور تحریکی سرگرمیوں میں کسی نہ کسی درجہ میں "عَلٰی بَصِیرَۃٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِی"[1] کا عکس پیدا ہو جائے گا! ـــــ رہا دوسرا باب' تو وہ تو احیاءِ اسلام اور غلبۂ دین کی جدوجہد میں مصروف و مشغول ہر صاحبِ فہم و شعور انسان کے لیے "لابدّ منہ" کی حیثیت رکھتا ہے، اس لیے کہ اس کے صحیح فہم و ادراک کے بغیر نہ صرف یہ کہ اُس کی بھاگ دوڑ اور سعی و جہد ع "آہ! وہ تیرِ نیم کش جس کا نہ ہو کوئی ہدف!" کی صورت اختیار کر سکتی ہے۔ (اَعَاذَنَا اللّٰہُ مِنْ ذٰلِکَ) ـــــ بلکہ اس کا بھی شدید خطرہ موجود رہتا ہے کہ انسان اپنی کم ہمّتی اور قوّتِ ارادی

---

[1] سورۃ یوسف: آیت ۱۰۸ ترجمہ: "پوری بصیرت کے ساتھ' میں خود بھی اور وہ بھی جو میری پیروی کر رہے ہیں۔"

کے ضعف کے باعث، یا ذراسی بددلی اور مایوسی یا اپنی کوشش اور محنت کے حسبِ منشا نتائج برآمد نہ ہوتے دیکھ کر سعی و جہد ہی سے دستکش ہو جاتے اور اپنی بے عملی اور تعطّل کے لیے علم اور تحقیق کے نام کو بٹہ لگاتے ہوئے کسی اُلٹی سیدھی دلیل کا سہارا لے لے ——— اس ضمن میں واقعہ یہ ہے کہ آیۂ مبارکہ "هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ" پر جو جامع اور مدلّل تحریر راقم کے قلم سے آج سے تیرہ سال قبل صادر ہو گئی تھی، میں اسے سراسر اللہ تعالیٰ کے خصوصی فضل و کرم کا مظہر اور ایک خاص وقت کی کیفیات اور خصوصی جذبے کا مرہونِ منّت سمجھتا ہوں ——— اور اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ وہ اسے نہ صرف ان لوگوں کے حق میں سُرمۂ چشم بنا دے جو اللہ تعالیٰ اور رسولؐ کے ساتھ خلوص و اخلاص کا رشتہ رکھنے کے باوجود تاحال دین کے حرکی تصوّر سے نا آشنا ہیں اور محض جامد مذہبیت پر تکیہ کیے ہوتے ہیں، بلکہ اُن بہت سے پُرانے راہروانِ راہِ حق کو بھی اپنا بھُولا ہوا سبق یاد دلانے کا ذریعہ بنا دے جو کسی شخص یا جماعت کے طرزِ عمل سے دل برداشتہ ہونے کے باعث اقامتِ دین کی جدّوجہد ہی سے کنارہ کش ہو گئے ہیں، اور اب مختلف گوشہ ہائے عافیت میں پناہ لیے ہوتے ہیں، تاکہ یہ "بھٹکے ہوتے راہی" بھی دوبارہ "سوئے حرم" گامزن ہو جائیں[1] ——— وَمَا ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِيْزٍ!

مقالۂ ثانیہ یعنی "انقلابِ نبویؐ کا اساسی منہاج" توجّہ کو اسلامی انقلاب کے مرحلۂ اولیٰ پر مرتکز کر کے اِس اندیشے کا سدّباب کرتا ہے کہ کوئی طاقتور جذبۂ عمل، انسان کی اُس طبعی کمزوری کی بنا پر جو "خُلِقَ الْاِنْسَانُ مِنْ عَجَلٍ"[2] میں بیان ہوتی ہے، بنیادی استحکام اور ابتدائی لوازم (PRE-REQUISITES) کو نظر انداز کر کے اپنی تیزروی اور عجلت پسندی کے باعث

---

1. "بھٹکے ہوتے آہو کو پھر سوئے حرم لے چل ۔ اس شہر کے خوگر کو پھر وسعتِ صحرا دے"! اقبالؔ
2. سورۃ الانبیاء: ۳۷۔ ترجمہ "انسان کی خلقت میں عجلت پسندی شامل ہے"۔

اپنے آپ کو خود ہی ناکامی کا مستحق نہ بنا لے ——— موضوع اور عنوان کی مناسبت سے ظاہر ہے کہ اس مقالے میں "انقلاب نبویؐ" کے بقیہ مراحل پر گفتگو خارج از بحث تھی، لیکن الحمدللہ کہ اب ان جملہ مراحل پر راقم کی جامع تالیف "منہج انقلاب نبویؐ" منصّۂ شہود پر آچکی ہے جس سے اسلامی انقلاب کے تمام مراحل از ابتدا تا انتہا واضح اور مبرہن ہو گئے ہیں ——— فللّٰہ الحمد والمنّۃ

جن حضرات کو اس کتابچے کے مطالعے سے کوئی رہنمائی میسر آئے، اُن سے استدعا ہے کہ وہ دعا کریں کہ اللہ تعالےٰ مجھے اور میرے ساتھیوں کو اس راہ پر ثبات اور استقامت عطا فرمائے جس کی نشاندہی اس کتابچے میں کی گئی ہے ——— اِدھر میں ان کے حق میں دُعا کرتا رہوں گا کہ علامہ اقبال کے اِس شعر کے مصداق کہ ؎

جسے نانِ جویں بخشی ہے تُو نے
اُسے بازوئے حیدرؓ بھی عطا کر!

اگر اللہ نے انہیں اس راہ کی صداقت اور حقانیت پر ذہنی اطمینان اور قلبی انشراح عطا فرما دیا ہے تو اس پر عملاً گامزن ہونے کی ہمّت اور توفیق بھی عطا فرمائے، واللّٰہُ الموفّق والمستعان!

اس کتابچے پر نظرثانی کے سلسلے میں جو تعاون قرآن اکیڈمی کے بزرگ استاد محترم حافظ احمد یار صاحب نے فرمایا اور جن مفید مشوروں سے نوازا، اُن کے لیے تہہ دل سے ممنون ہوں۔

آخر میں اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ میری اس حقیر پیشکش کو شرفِ قبول عطا فرما کر اسے دین حق کی نشاۃ ثانیہ کی جدوجہد کے سلسلے کی ایک مفید کڑی اور میرے حق میں توشۂ آخرت بنا دے۔ آمین

خاکسار **اسرار احمد** عفی عنہ

۲۴ جولائی ۱۹۸۸ء ——— ۹ ذی الحجہ ۱۴۰۸ھ

نبی اکرم
صلے اللہ علیہ وسلم
کا مقصدِ بعثت
قرآن حکیم کی روشنی میں

★

تمہید

ہمارا ایمان ہے کہ سیدِ وُلدِ آدم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم صرف ایک نبی ہی نہیں "خاتم النبیین" ہیں اور صرف ایک رسُول ہی نہیں "آخر الرُسل" ہیں اور آپؐ پر نبوت و رسالت کا صرف اختتام ہی نہیں اتمام و اکمال بھی ہوا ہے۔

اس اعتبار سے غور کیا جائے تو جہاں یہ بات قطعی اور یقینی نظر آتی ہے کہ آپؐ کی بعثت کا مقصد جُملہ انبیاء و رسل کے مقصدِ بعثت سے مختلف نہیں ہو سکتا وہاں یہ بھی لازمی ہے کہ آپؐ کی بعثت کے مقصد میں ایک اِتمامی شان اور تکمیلی رنگ بھی ہو جس سے نبیوں اور رسُولوں کی مقدس جماعت میں آپؐ کا منفرد مقام اور امتیازی مرتبہ واضح ہو جائے۔

گویا آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے مقصد کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ پہلے ہم یہ سمجھنے کی کوشش کریں کہ از رُوئے قرآنِ حکیم بعثتِ انبیاء و رُسل کا عمومی اور اساسی مقصد کیا ہے؟ اور پھر یہ جاننے کی کوشش کریں کہ بحیثیت خاتم النبیین و آخر المرسلین آپ کے مقصدِ بعثت کی امتیازی شان کیا ہے؟

بعثتِ انبیاءؑ

کا اساسی مقصد

ایمانیات ثلاثہ

یہ تو سب جانتے ہیں کہ اسلام کے اساسی معتقدات تین ہیں۔ یعنی، توحید[۱]، معاد[۲] اور رسالت[۳] یا ایمان[۱] باللہ، ایمان[۲] بالآخرت اور ایمان[۳] بالرّسالت لیکن عام طور پر اس پہلو پر توجہ نہیں دی جاتی کہ ان تینوں میں گہرا منطقی ربط موجود ہے اور یہ تینوں مل کر ایک ناقابلِ تقسیم وحدت کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ آیئے ذرا اختصار کے ساتھ سمجھنے کی کوشش کریں کہ ان تینوں کا اصل حاصل کیا ہے اور ان کے مابین ربط و تعلّق کی نوعیّت کیا ہے؟

ایمان باللہ

فلسفیانہ موشگافیوں اور متکلّمانہ نکتہ طرازیوں سے قطع نظر ایمان باللہ کا اصل حاصل یہ ہے کہ یہ عالمِ وجود اور سلسلۂ کون و مکاں جو تاحدِ نظر ہماری نگاہوں کے سامنے پھیلا ہوا ہے نہ ہمیشہ سے ہے نہ ہمیشہ رہے گا بلکہ حادث بھی ہے اور ہالک[۱] و فانی[۲] بھی۔ البتہ ایک ذات ایسی ہے جس کی نہ ابتدا ہے نہ انتہا، اسے اللہ کہہ لیا جائے یا الرّحمٰن کوئی فرق واقع نہیں ہوتا[۳]۔ وہ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا، اور تمام صفاتِ کمال سے بتمام و کمال متصف ہے اور ہر اعتبار سے تنہا اور یکتا ہے نہ کوئی اس کی ذات میں

۱؎ كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ إِلَّا وَجْهَهُ لَهُ الْحُكْمُ وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ ٥ (القصص: ۸۸)

۲؎ كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ ٥ وَيَبْقَىٰ وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ ٥ (الرحمٰن: ۲۶-۲۷)

۳؎ قُلِ ادْعُوا اللَّهَ أَوِ ادْعُوا الرَّحْمَٰنَ ط أَيًّا مَّا تَدْعُوا فَلَهُ الْأَسْمَاءُ الْحُسْنَىٰ ج (بنی اسرائیل: ۱۱۰)

شریک ہے نہ صفات میں نہ حقوق میں نہ اختیارات میں![1]

اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کو "بِالْحَقِّ" اور "اِلٰی اَجَلٍ مُّسَمًّی" تخلیق فرمایا ہے اور اس سلسلۂ تخلیق کا مرتبۂ کمال ہے انسان، جسے اس تعالیٰ نے اپنی صورت پر تخلیق فرمایا،[2] پھر اس میں اپنی رُوح میں سے پھونکا اور اسے اپنی خلافت و نیابت سے سرفراز فرما دیا۔ گویا اسے ایک اعتبار سے جُملہ مراتبِ تنزّل کا حاصل بھی قرار دیا جا سکتا ہے بقول حضرتِ بیدلؒ ؎

ہر دو عالم خاک شد تا بست نقشِ آدمی

اے بہارِ نیستی از قدرِ خود ہشیار باش!

اور ایک دوسرے پہلو سے پُورے سلسلۂ ارتقاء کا نقطۂ عروج بھی!

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْ اَحْسَنِ	ہم نے پیدا فرمایا انسان کو بہترین
تَقْوِیْمٍ ۝ ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ	ساخت پر۔ پھر لوٹا دیا اس کو نچلوں
سٰفِلِیْنَ ۝ (سورۃ التین)	میں سب سے نچلا!

ایمان بالآخرت

کا حاصل یہ ہے کہ اس انسان کی یہ موجودہ دنیوی زندگی ہی کُل زندگی نہیں بلکہ یہ تو اس کی اصل زندگی کا حقیر سا آغاز ہے یا اس

---

[1] (i) قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ۝ اَللّٰهُ الصَّمَدُ ۝ لَمْ یَلِدْ وَلَمْ یُوْلَدْ ۝ وَلَمْ یَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ ۝ (سورۃ الاخلاص) (ii) وَقُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ لَمْ یَتَّخِذْ وَلَدًا وَّلَمْ یَكُنْ لَّهٗ شَرِیْكٌ فِی الْمُلْكِ وَلَمْ یَكُنْ لَّهٗ وَلِیٌّ مِّنَ الذُّلِّ وَكَبِّرْهُ تَكْبِیْرًا ۝ (سورۃ بنی اسرائیل: آخری آیت) (iii) وَلَا یُشْرِكُ فِیْ حُكْمِهٖۤ اَحَدًا ۝ (سورۃ الکہف: ۲۶)

[2] خَلَقَ اللّٰهُ اٰدَمَ عَلٰی صُوْرَتِهٖ — اللہ نے آدم کو اپنی صورت پر تخلیق فرمایا۔
اَلْحَدِیْث: شیخینؒ عن ابی ہریرہؓ

کی کتابِ حیات کا مختصر سا دیباچہ اور مقدّمہ یا اس کے سفرِ حیات کا محض ایک آزمائشی اور امتحانی وقفہ۔ بقول علّامہ اقبال مرحوم ؎

تو اسے پیمانۂ امروز و فردا سے نہ ناپ — جاوداں، پیہم دواں، ہردم جواں ہے زندگی
قلزمِ ہستی سے تو ابھرا ہے مانندِ حباب — اس زیاں خانے میں تیرا امتحاں ہے زندگی

موت فنا یا معدوم ہو جانے کا نام نہیں بلکہ صرف ایک عالم سے دُوسرے عالم کو نقلِ مکانی کا نام ہے جس کی پہلی اور عارضی منزل ہے عالمِ برزخ جس کا آغاز موت کے فوراً بعد ہو جاتا ہے اور دوسری اور مستقل منزل ہے عالمِ آخرت جس کا آغاز یومِ قیامت سے ہوگا۔ بعث بعد الموت، حشر و نشر، حساب و کتاب، جزا و سزا اور جنّت و دوزخ سب اسی ایمان بالآخرت کی تفاصیل ہیں بقول نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم:

وَاللّٰهِ لَتَمُوْتُنَّ كَمَا تَنَامُوْنَ ثُمَّ لَتُبْعَثُنَّ كَمَا تَسْتَيْقِظُوْنَ ثُمَّ لَتُحَاسَبُنَّ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ثُمَّ لَتُجْزَوُنَّ بِالْاِحْسَانِ اِحْسَانًا وَّبِالسُّوْءِ سُوْءًا وَاِنَّهَا لَجَنَّةٌ اَبَدًا اَوْ لَنَارٌ اَبَدًا

(ماخوذ از خطباتِ نبویؐ بحوالہ نہج البلاغہ)

(ترجمہ) خدا کی قسم تم سب پر موت طاری ہو کر رہے گی جیسے تم روزانہ رات کو سو جاتے ہو، پھر تمہیں لازماً اٹھا لیا جائے گا جیسے تم روزانہ صبح کو بیدار ہوتے ہو پھر یقیناً تم سے حساب لیا جائے گا اس کا جو تم کر رہے ہو۔ پھر بدلہ مل کر رہے گا بھلائی کا بھلا اور برائی کا بُرا۔ اور وہ یا تو جنّت ہے ہمیشہ کے لیے یا آگ ہے ہمیشہ کے لیے!

ایمان باللہ اور ایمان بالآخرت کا باہمی ربط

غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ایمان باللہ اور ایمان بالآخرت باہم

۱۔ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا (سورۃ الملک:۲)

پیدا کیا سلسلۂ موت و حیات تاکہ جانچے تمہیں کہ کون ہے تم میں سے سب سے اچھے عمل کرنے والا۔

مل کر مبدأ و معاد یا حیاتِ انسانی کی ابتدا و انتہا کے علم کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ اور ان سے سفرِ حیات کے آغاز و انجام کا تعیّن ہو جاتا ہے بفحوائے الفاظِ قرآنی" اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ" (ترجمہ) ہم اللہ ہی کے ہیں اور اسی تعالیٰ کی طرف ہمیں لوٹ جانا ہے!

واقعہ یہ ہے کہ مبدأ و معاد کے اس علم کے بغیر انسان کی حالت یا تو اس مسافر کی سی ہے جسے کسی افتاد کے باعث نہ تو یہ یاد رہے کہ اس نے سفر کا آغاز کہاں سے کیا تھا نہ یہ یاد رہے کہ اس کے سفر کی منزل کون سی ہے۔ گویا بقول فانی ؎

ہم تو فانی جیتے جی وہ میّت ہیں بے گور و کفن
غربت جس کو راس نہ آئی اور وطن بھی چھوٹ گیا!

یا بقول غالب ؎

رو میں ہے رخشِ عمر کہاں دیکھیے تھمے
نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

اس حال میں انسان بغیر کسی منزلِ مقصود کے تعیّن کے محض بطن و فرج کے تقاضوں سے مجبور ہو کر گویا پیٹ کے بل گھسٹتے ہوئے زندگی بسر کر دیتا ہے۔ مطابقِ تمثیلِ قرآنی:

اَفَمَنْ یَّمْشِیْ مُکِبًّا عَلٰی	بھلا ایک جو چلے اوندھا اپنے منہ کے
وَجْهِهٖٓ اَهْدٰٓی اَمَّنْ یَّمْشِیْ	بل وہ سیدھی راہ پائے یا وہ شخص جو چلے
سَوِیًّا عَلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ۔	سیدھا ایک سیدھی راہ پر؟
(سورۃ الملک: ۲۲)	(ترجمہ حضرت شیخ الہندؒ)

یا پھر اُس کی کیفیت اُس پتنگ کی سی ہے جس کی ڈور کٹ چکی ہو اور اب وہ محض ہوا کے رحم و کرم پر ہو کر جہاں چاہے اُسے لے جائے۔ از روئے تمثیلِ قرآنی:

فَکَاَنَّمَا خَرَّ مِنَ السَّمَآءِ	تو گویا وہ گر پڑا بلندی سے، پھر اُچک
فَتَخْطَفُهُ الطَّیْرُ اَوْ تَهْوِیْ	لیتے ہیں اسے (مردار خور) پرندے

بِهِ الرِّيحُ فِي مَكَانٍ سَحِيقٍ (سورۃ الحج : ۳۱) یا لے جا پھینکتی ہے اسے ہوا کسی دور دراز مقام پر!

اور اس ع "نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم" کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ انسان شکوک و شبہات کا شکار ہو کر رہ جاتا ہے گویا لاادریت (AGNOSTICISM) اور ارتیابیت (SCEPTICISM) کے سوا انسان کے پاس اور کچھ رہ ہی نہیں جاتا جس کی منطقی انتہا یہ ہے کہ وہ خود اپنی ہستی اور وجود کے بارے میں بھی شکوک و شبہات میں مبتلا ہو جاتے، گویا:

ع "رہا یہ وہم کہ ہم ہیں سو وہ بھی کیا معلوم!"[1]

ایک اہم سوال

یہاں ایک اہم سوال پیدا ہوتا ہے جس کے صحیح جواب ہی پر ایمان باللہ اور ایمان بالآخرت کے ساتھ ایمان بالرسالت کے صحیح منطقی ربط کے فہم و ادراک کا دار و مدار ہے یعنی یہ کہ انسان سے آخرت میں حساب کس بنیاد پر لیا جاتے گا یا بالفاظِ دیگر محاسبۂ اخروی کی اساسات کیا ہیں۔

مطالعۂ قرآنِ حکیم سے اس کا جو جواب سامنے آتا ہے اُسے ایک جملے میں تو اس طرح ادا کیا جا سکتا ہے کہ

انسان اولاً اور اصلاً تو مسئول ہے ان استعداداتِ فطریہ یا لطائفِ اصلیہ کی بنیاد پر جو ہر انسان میں ودیعت کیے گئے ہیں جیسے سمع و بصر، عقل و شعور اور تفکّر و اعتبار یا لطیفۂ نفس، لطیفۂ قلب اور لطیفۂ روح ——— اور ثانیاً اللہ تعالیٰ نے انسان

---

[1] شادؔ عظیم آبادی نے انسان کی اس ذہنی کیفیت کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا تھا کہ ؎

سنی حکایتِ ہستی تو درمیاں سے سنی نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم!

جسے فانیؔ بدایونی نے اپنی منطقی انتہا تک بایں طور پہنچایا کہ ؎

نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم رہا یہ وہم کہ ہم ہیں سو وہ بھی کیا معلوم!

پر' اتمامِ حجت' کا اہتمام کیا ہے بذریعۂ اجرائے وحی و انزالِ کتب اور بعثتِ انبیاء و ارسالِ رُسل ——— لیکن یہ بات ذرا تفصیل طلب ہے!

لطیفۂ نفس

انسان کے متذکرہ بالا لطائفِ ثلاثہ میں سے ادنیٰ ترین لطیفۂ نفس ہے جس کے اعتبار سے بلاشبہ انسان ایک ترقی یافتہ حیوان ہے اور جو بالکلیہ عالمِ خلق سے تعلّق رکھتا ہے چنانچہ اس کا رجحانِ اصلی عالمِ اسفل ہی کی جانب ہے اور اس کی گہرائیوں میں واقعتہً "اَمَّارَةٌ بِالسُّوْءِ" ہی کا طوفان موجزن ہے جس کا ایک پہلو سے مشاہدہ کیا مارکس نے، دوسری جانب سے مشاہدہ کیا فرائڈ نے اور تیسری طرف سے مطالعہ کیا اڈلر نے اور یہی ہے وجودِ انسانی کا وہ جانبِ اسفل جس کے بارے میں کچھ حقائق منکشف ہوئے ڈارون پر!

لطیفۂ روح

اور بالکل دوسری انتہا پر ہے لطیفۂ روح جس کی نسبت ہے خود ذاتِ باری تعالیٰ کی جانب (وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ![1]) اور جس کا تعلّق ہے کلیتہً عالمِ امر سے (قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ![2]) اور جس کا اصل رُخ ہے ع " اپنے مرکز کی طرف مائلِ پرواز تھا حُسن!" کے مصداق عالمِ بالا کی جانب، چنانچہ اس میں محبتِ الٰہی کا ایک جذبہ اور 'لِقاءِ رَبّ' کا ایک داعیہ ایک دھیمی آنچ والی آگ کے مانند تو ہر دم ہی سلگتا ہے بقول علامہ اقبال مرحوم ؎

کبھی اے حقیقتِ منتظر نظر آ لباسِ مجاز میں
کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبینِ نیاز میں!

البتہ کبھی کبھی اس میں ایک شعلے کی سی لپک بھی پیدا ہو جاتی ہے جسے بعض اربابِ دانش نے شعلۂ ملکوتی (DIVINE SPARK) سے تعبیر کیا ہے۔

خیر و شر کا داخلی معرکہ

گویا غلط نہیں کہا جس نے بھی کہا کہ "انسان عالمِ اصغر ہے" اور واقعتہً انسان کے باطن میں سب ہی کچھ موجود ہے چنانچہ

---

[1] سورۃ الحجر: ۲۹ - اور صٓ: ۷۲ [2] سورۃ بنی اسرائیل: ۸۵

بدی کے پست ترین رجحانات بھی ہیں اور نیکی کے اعلیٰ ترین داعیات بھی۔ اور ان ہی کے مابین ایک شدید کشمکش اور مستقل جنگ جاری ہے انسان کی باطنی شخصیّت کے وسیع و عریض میدانِ کارزار میں!

مسئولیّت کی اساساتِ اصلیّہ

لیکن اس معرکۂ خیر و شر میں خالقِ فطرت نے انسان کو بے یار و مددگار یا بے تیر و تفنگ نہیں جھونک دیا بلکہ اسے بہت سی استعدادات سے نواز کر اور بہت سی قوتوں سے مسلّح کر کے بھیجا ہے، چنانچہ اس کی شخصیّت کا ادنیٰ ترین پہلو یعنی 'لطیفۂ نفس' بھی ایک جانب مسلّح ہے استعداداتِ سماعت و بصارت اور قوائے تعقّل و تفکّر سے اور دوسری جانب مسلّح ہے ایک اخلاقی حِسّ سے جو تمیز کرتی ہے خیر اور شر میں اور پہچانتی ہے نیکی اور بدی کو۔ بنا بریں خود گواہ ہے اپنے آپ پر بصورت نفسِ لوّامہ!

بفحوائے آیاتِ قرآنی:

۱۔ اِنَّا خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ اَمْشَاجٍ ۖ نَّبْتَلِيْهِ فَجَعَلْنٰهُ سَمِيْعًا بَصِيْرًا ؁ (سورۃ الدھر: ۲)	ہم نے پیدا کیا انسان کو ملے جلے نطفہ سے تاکہ آزمائیں اسے، چنانچہ بنا دیا ہم نے اسے سُننے والا، دیکھنے والا!
۲۔ وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا ؁ فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا ؁ (سورۃ الشمس: ۷-۸)	اور (قسم ہے) نفس کی اور جیسا کہ اسے بنایا ٹھیک، پھر ودیعت کر دی اس میں سوجھ بدی اور نیکی کی!
۳۔ لَآ اُقْسِمُ بِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ ؁ وَلَآ اُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ ؁ (سورۃ القیٰمۃ: ۱-۲)	نہیں! قسم ہے مجھے قیامت کے دن کی اور نہیں! (بلکہ) قسم کھاتا ہوں میں نفسِ ملامت گر کی!

۴-	بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰی نَفْسِہٖ بَصِیْرَۃٌ ۝ وَّلَوْ اَلْقٰی مَعَاذِیْرَہٗ ۝	بلکہ انسان خود ہی گواہ ہے اپنے نفس پر، خواہ بڑا بنائے بہانے!

(سورۃ القیٰمۃ: ۱۴-۱۵)

بنا بریں ہر ذی نفس خود اپنی جگہ مسئول ہے اور جزا و سزا کے قابل اور اس کا مستحق یہاں تک کہ عدالت اُخروی میں ہر نفس کو اپنی جوابدہی خود ہی کرنی ہوگی اور اپنا محاسبہ خود ہی بھگتنا (FACE کرنا) ہوگا۔ بفحوائے الفاظِ قرآنی:

یَوْمَ تَاْتِیْ کُلُّ نَفْسٍ تُجَادِلُ عَنْ نَّفْسِهَا وَتُوَفّٰی کُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ۔	جس دن آئے گا ہر نفس مدافعت کرتے ہوئے اپنی جانب سے۔ اور پورا پورا صلہ مل جائے گا ہر نفس کو اپنے کیے کا!

(سورۃ النحل: ۱۱۱)

اور نہ کوئی نفس دُوسرے نفس کے کام آسکے گا، نہ اس کی جانب سے کوئی سفارش یا فدیہ قبول ہوگا، نہ اسے کسی طرف سے مدد ہی مل سکے گی۔ بفحوائے الفاظِ قرآنی:

وَاتَّقُوْا یَوْمًا لَّا تَجْزِیْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَیْئًا وَّلَا یُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا یُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا هُمْ یُنْصَرُوْنَ ۝	اور ڈرو اس دن سے جب نہ کام آسکے گا کوئی نفس کسی دوسرے نفس کے کچھ بھی۔ اور نہ قبول کی جائے گی اس کی جانب سے کوئی سفارش، اور نہ قبول ہوگا کوئی فدیہ اور نہ ہی ان کی کوئی مدد ہوگی!

(سورۃ البقرۃ: ۴۸)

لطیفۂ قلب

اللہ نے اس پر بھی اکتفا نہیں فرمایا بلکہ انسان میں ایک اور جوہرِ نایاب ودیعت فرمادیا جس میں معرفتِ ربانی کی شمع بھی روشن ہے اور جملہ حقائق کو نیہ بھی منعکس ہیں، ہماری مراد ہے 'لطیفۂ قلب' سے جو گویا جامِ جہاں نما ہے یا اس آئینے کے مانند جس میں عالمِ اکبر کے تمام حقائق کا انعکاس موجود ہے گویا اگر لطیفۂ نفس قوائے سمع وبصر اور

تعقّل وتفکّر سے مسلّح ہے جو اساس ہیں جملہ علومِ مادّی ونظری کی تو لطیفۂ قلب مسلّح ہے ان قوائے تفہّم وتفقہّ سے جو وجدانی طور پر ادراک کرتے ہیں لطیف تر حقائق کونیہ اور معارفِ لدنیہ کا بقول شاعر

~ بینی اندر دل علومِ انبیاء — بے کتاب و بے معید و اوستا!

اور ~ صد کتاب و صد ورق در نار کن — رُوئے دل را جانبِ دلدار کُن!

اور ~ در کنز وہدایہ نہ تواں یافت خدا را — در آئینہ دل بیں کہ کتابے بہ ازیں نیست![1]

الغرض لطیفۂ قلب کے ودیعت کیے جانے کے بعد انسان کی مسئولیت پر آخری مہر تصدیق ثبت ہو جاتی ہے بفحوائے الفاظِ قرآنی:

اِنَّ السَّمۡعَ وَ الۡبَصَرَ وَ الۡفُؤَادَ	یقیناً کان آنکھ اور دل ہر ایک کے
کُلُّ اُولٰٓئِکَ کَانَ عَنۡہُ مَسۡـُٔوۡلًا ○	بارے میں پرسش ہو کر رہے گی!

(سورۃ بنی اسرائیل: ۳۶)

اور وہ لوگ حیوان اور چوپائے ہی نہیں ان سے بھی ارذل و اسفل قرار پاتے ہیں جو اپنی ان

---

[1] اسے محض شاعرانہ خیال آرائی نہیں سمجھنا چاہیے، اس لیے کہ خود کلام نبوت میں 'قلب' کے لیے اسی قسم کے الفاظ وارد ہوتے ہیں مثلاً اُس مشہور حدیث میں جس کی رُو سے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:

اِنَّ ھٰذِہِ الۡقُلُوۡبَ لَتَصۡدَأُ کَمَا	یہ دل بھی زنگ آلود ہو جاتے ہیں بالکل ایسے جیسے
یَصۡدَءُ الۡحَدِیۡدُ اِذَا اَصَابَہُ الۡمَاءُ	لوہے پر پانی پڑنے سے زنگ آجاتا ہے!

جس پر صحابہ کرامؓ نے بالکل صحیح سوال کیا کہ:

فَمَا جِلَاءُ ھَا یَا رَسُوۡلَ اللّٰہِ؟	حضور! پھر انہیں صیقل کیسے کیا جائے؟

جواباً ارشاد ہوا:

کَثۡرَۃُ ذِکۡرِ الۡمَوۡتِ	موت کو کثرت سے یاد کرنا اور قرآن کی
وَتِلَاوَۃِ الۡقُرۡاٰنِ!	کثرت کے ساتھ تلاوت!

فطری استعدادات کو بے کار رکھ چھوڑیں یا قوائے فطریہ کو شل کرلیں، بفحوائے آیتِ قرآنی:

لَهُمْ قُلُوبٌ لَّا يَفْقَهُونَ	ان کے دل ہیں لیکن ان سے سمجھتے نہیں
بِهَا وَلَهُمْ أَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُونَ	اور آنکھیں ہیں لیکن ان سے دیکھتے
بِهَا وَلَهُمْ آذَانٌ لَّا يَسْمَعُونَ	نہیں اور کان ہیں پر ان سے سُنتے نہیں
بِهَا أُولَٰئِكَ كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ	وہ چوپایوں کے مانند ہیں بلکہ ان سے
أَضَلُّ ط (سورۃ الاعراف: ۱۷۹)	بھی گئے گزرے!

خیر و شر کے خارجی داعیات

خیر و شر کے مابین جو داخلی معرکہ انسان کی شخصیّت کے باطنی میدان کارزار میں جاری ہے، اس کو تقویت پہنچانے والے کچھ داعیاتِ خیر و شر خارج میں بھی موجود ہیں۔ بقول علّامہ اقبال مرحوم:

دنیا کو ہے پھر معرکۂ رُوح و بدن پیش	تہذیب نے پھر اپنے درندوں کو اُبھارا
اللہ کو پا مردیِ مومن پہ بھروسہ	ابلیس کو یورپ کی مشینوں کا سہارا!

لیکن یہ بات اچھی طرح سمجھ لینے کی ہے کہ اصل اور فیصلہ کن اہمیّت داخلی کشاکش ہی کی ہے، خارجی داعیات محض تقویّت کے موجب ہو سکتے ہیں خواہ وہ خیر کی جانب تشویق و ترغیب پر مشتمل ہوں خواہ شر کی طرف تحریص و تحریض پر، چنانچہ کسی داعیِ شر حتّٰی کہ ابلیس لعین و شیطانِ رجیم تک کو یہ قوّت و اختیار ہے کہ وہ کسی انسان کو بالجبر برائی پر مائل کر سکے، بفحوائے آیتِ قرآنی:

۱۔ إِنَّ عِبَادِي لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ	جو میرے بندے ہیں تیرا ان پر کچھ
سُلْطَانٌ إِلَّا مَنِ اتَّبَعَكَ	زور نہیں! سوائے اس کے جس نے
مِنَ الْغَاوِينَ ٥	خود ہی تیری پیروی کی بھٹکے ہوؤں
(سورۃ الحجر: ۴۲)	میں سے!
۲۔ إِنَّهُ لَيْسَ لَهُ سُلْطَانٌ	اسے (ابلیس کو) کوئی اختیار حاصل نہیں
عَلَى الَّذِينَ آمَنُوا وَعَلَىٰ	ہے ان پر جو ایمان رکھتے ہیں اور اپنے

رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ۝ — رُبّ پر بھروسہ کرتے ہیں!

(سورۃ النحل: ۹۹)

اور نہ ہی کسی داعیٔ خیر حتیٰ کہ سید الاوّلین والآخرین، خاتم النبیین وآخر المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ اختیار حاصل تھا کہ جسے چاہتے ہدایت سے نواز دیتے: از رُوئے آیت قرآنی:

اِنَّكَ لَا تَهْدِيْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ (سورۃ القصص: ۵۶)

(اے نبی!) تو راہ پر نہیں لا سکتا جسے چاہے، بلکہ اللہ ہی جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے۔

خیر اور شر کے ان خارجی داعیوں میں سے جہاں تک شر کے داعیوں کا تعلق ہے انہیں تو سب جانتے ہیں یعنی ابلیس اور اس کی صُلبی و معنوی ذرّیت انسانوں میں سے بھی اور جنوّں میں سے بھی! جن کے بارے میں قرآن میں بھی وضاحت ہے کہ:

اِنَّهٗ يَرٰىكُمْ هُوَ وَقَبِيْلُهٗ مِنْ حَيْثُ لَا تَرَوْنَهُمْ ؕ (سورۃ الاعراف: ۲۷)

وہ (ابلیس لعین) دیکھتا ہے تم کو اور اس کے ہم جنس بھی، جہاں سے تم ان کو نہیں دیکھتے!

اور حدیث نبویؐ میں بھی تصریح ہے کہ "اِنَّ الشَّيْطَانَ يَجْرِىْ مِنَ الْاِنْسَانِ مَجْرَى الدَّمِ! (صحیح بخاری) یعنی شیطان انسان کے وجود میں خون کے مانند سرایت کر جاتا ہے، لیکن داعیانِ خیر کے بارے میں یہ حقیقت بہت سے لوگوں کی نگاہوں سے اوجھل ہے کہ ملائکہ حیاتِ دنیوی کے دوران اصحاب خیر اور اہلِ حق کے لیے تقویت وتثبیت کا ذریعہ بنتے ہیں اور جس طرح شیاطین جنّ وانس انسان کے نفسانی داعیات کی تحریک واشتعال کا سبب بنتے ہیں اسی طرح ملائکہ انسان کی روحِ ملکوتی میں نشاط واہتزاز کا ذریعہ بنتے ہیں اور معرکۂ حق وباطل کے دوران اہل حق کے قلبی سکون واطمینان اور عملی ثبات واستقلال کا سبب بنتے ہیں بفحوائے آیاتِ قرآنی:

هُوَ الَّذِیْ یُصَلِّیْ عَلَیْکُمْ وَمَلٰٓئِکَتُہٗ لِیُخْرِجَکُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوْرِ ؕ

(سورۃ الاحزاب : ۴۳)

وہی (اللہ) ہے جو رحمت بھیجتا ہے تم پر اور اس کے فرشتے بھی، تاکہ نکالے تمہیں اندھیروں سے اُجالے میں!

۲۔ اِذْ یُوْحِیْ رَبُّکَ اِلَی الْمَلٰٓئِکَۃِ اَنِّیْ مَعَکُمْ فَثَبِّتُوا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ؕ

(سورۃ الانفال : ۱۲)

جب وحی (کے ذریعے حکم) فرما رہا تھا تیرا رب فرشتوں کو کہ میں تمہارے ساتھ ہوں پس دلوں کو جمائے رکھو اہلِ ایمان کے!

۳۔ اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَیْھِمُ الْمَلٰٓئِکَۃُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّۃِ الَّتِیْ کُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ ۝ نَحْنُ اَوْلِیٰٓؤُکُمْ فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا وَفِی الْاٰخِرَۃِ ۚ

(سورۃ حٰم السجدۃ : ۳۰-۳۱)

بے شک جن لوگوں نے کہا اللہ ہی ہمارا رب ہے پھر اس پر جم گئے۔ ان پر نازل ہوتے ہیں فرشتے کہ نہ خائف ہو نہ غمگین اور خوشخبری حاصل کرو اُس جنّت کی جس کا تم سے وعدہ کیا گیا تھا۔ ہم ہیں تمہارے ساتھی اور مددگار دنیا کی زندگی میں بھی اور آخرت میں بھی!

اتمامِ حجّت اور قطعِ عذر

اب ہم موضوعِ زیرِ بحث کی بحثِ اوّل کے آخری نقطے تک پہنچ گئے ہیں جو یہ ہے کہ جس طرح انسان کے اصل داخلی داعیاتِ خیر و شر ہیں اس کے لطائفِ نفس و رُوح، لیکن اصل حجّتِ داخلی بنتی ہیں استعدادات سمع و بصر و تعقّل و تفکّر اور حسِّ اخلاقی اور تفقّہ قلبی جنہیں انسان کی مسئولیت کی اساساتِ اصلیہ کہا جا سکتا ہے، اسی طرح اصل خارجی داعیانِ خیر و شر تو ہیں علی الترتیب ملائکہ کرام اور ابلیس اور اس کی ذریّت صُلبی و معنوی لیکن اس ضمن میں اتمامِ حجّت ہوتا ہے اجرائے وحی، تنزیلِ کتب،

بعثتِ انبیاء اور ارسالِ رُسل سے جن کی حیثیت ہے حجّتِ خارجی کی اور جن کا مجموعی نام ہے ایمان بالرّسالت!

چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:۔

۱۔ رُسُلاً مُّبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌۢ بَعْدَ الرُّسُلِ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ؁

(سورۃ النساء : ۱۶۵)

(بھیجے اللہ نے) رسول بشارت دینے والے اور خبردار کرنے والے۔ تاکہ نہ رہے لوگوں کے پاس کوئی عذر و دلیل اللہ کے (محاسبہ کے) مقابلے میں۔ اور اللہ تو ہے ہی زبردست اور دکمال حکمت والا!

۲۔ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ قَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلُنَا يُبَيِّنُ لَكُمْ عَلٰى فَتْرَةٍ مِّنَ الرُّسُلِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا جَآءَنَا مِنْۢ بَشِيْرٍ وَّلَا نَذِيْرٍ فَقَدْ جَآءَكُمْ بَشِيْرٌ وَّنَذِيْرٌ ط وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ قَدِيْرٌ ؁

(سورۃ المائدۃ : ۱۹)

اے اہلِ کتاب! تمہارے پاس آگیا ہے ہمارا رسولؐ جو واضح کر رہا ہے تم پر (ہماری ہدایت) اس کے باوجود کہ (عارضی طور پر) منقطع ہو چکا تھا سلسلۂ رسالتؐ مبادا تم کہو کہ نہیں آیا ہمارے پاس کوئی بشارت دینے والا اور خبردار کرنے والا۔ تو اب آگیا ہے تمہارے پاس بشارت دینے والا اور خبردار کرنے والا۔ اور اللہ کو تو ہر چیز پر قدرت حاصل ہے ہی!

گویا بعثتِ انبیاء اور ارسالِ رسل کی اصل غرض و غایت ہے اتمامِ حجّت اور قطعِ عذر تاکہ انسان پر اللہ کی جانب سے آخری حجّت قائم ہو جائے اور اس کے پاس اپنی غلط روی یا کج عملی کے لیے کوئی عذر اور بہانہ باقی نہ رہ جائے۔

یہاں اس حقیقت کو پھر ذہن میں تازہ کر لیا جائے کہ جس طرح خیر و شر کے دوسرے خارجی داعیات کو انسان پر کوئی اختیار و اقتدار حاصل نہیں بلکہ ان کی حیثیت محض ترغیب و

تحریص اور تحریک و تشویق کی ہے اسی طرح نبوّت و رسالت کی اصل نوعیت بھی دعوت و تبلیغ کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انبیاء و رسل کے لیے قرآن مجید میں سب سے زیادہ کثیر الاستعمال اصطلاح مبشّرین و منذرین ہی کی ہے۔ جیسے وَمَا نُرْسِلُ الْمُرْسَلِيْنَ اِلَّا مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ (سورۃ الکہف: ۵۶) اور وحی و کتاب کے لیے سب سے زیادہ کثیر الاستعمال الفاظ، ذکر، ذکریٰ اور تذکرۃ' کے ہیں۔ جیسے:۔

۱۔	اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَ اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ○ (سورۃ الحجر: ۹)	یقیناً ہم ہی نے اتارا ہے یہ 'ذکر' (یعنی قرآن مجید) اور ہم ہی ہیں اس کے محافظ و نگہبان!
۲۔	طٰهٰ ○ مَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ لِتَشْقٰٓى ○ اِلَّا تَذْكِرَةً لِّمَنْ يَّخْشٰى ○ (سورۃ طٰہٰ: ۱-۲-۳)	(اے نبی) ہم نے تم پر یہ قرآن اس لیے تو نہیں اتارا کہ تم مشقّت میں پڑ جاؤ بلکہ (اتارا اسے) صرف یاددہانی کے طور پر ان کے لیے جو ڈرتے ہوں!
۳۔	كَلَّآ اِنَّهَا تَذْكِرَةٌ ○ (سورۃ عبس: ۱۱)	نہیں! یہ ایک یاددہانی ہے!
۴۔	تَبْصِرَةً وَّذِكْرٰى لِكُلِّ عَبْدٍ مُّنِيْبٍ ○ (سورۃ قٓ: ۸)	سمجھانے اور یاد دلانے کو، اس بندے کے لیے جو رجوع کرے!
۵۔	اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَذِكْرٰى لِمَنْ كَانَ لَهٗ قَلْبٌ اَوْ اَلْقَى السَّمْعَ وَهُوَ شَهِيْدٌ ○ (سورۃ قٓ: ۳۷)	اس میں یاددہانی ہے اس کے لیے جس کے پاس ہو دل (زندہ و بیدار) یا کان لگا کر سنے پوری توجہ کے ساتھ!
۶۔	فَذَكِّرْ ۚ اِنَّمَآ اَنْتَ مُذَكِّرٌ ○ لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُصَيْطِرٍ ○	تو (اے نبی) تم یاددہانی کراتے جاؤ۔ تمہارا کام تو بس یاددہانی کرانا ہی ہے۔ ان

پر داروغہ تو ہو نہیں (کہ ضرور ہدایت پر لے آؤ!) (سورۃ الغاشیۃ : ۲۱-۲۲)

اور ان سب کا مجموعی حاصل یہ ہے کہ انسان پر ایک خارجی گواہی اور شہادت قائم ہو جاتی ہے۔ چنانچہ کارِ رسالت کی تعبیر کے لیے سب سے زیادہ جامع اصطلاح 'شہادت' کی ہے اور فریضۂ رسالت کا اصل حاصل شہادت علی النّاس ہی ہے اس دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی بفحوائے آیاتِ قرآنی :

۱۔ اِنَّآ اَرۡسَلۡنَآ اِلَيۡكُمۡ رَسُوۡلاً شَاهِدًا عَلَيۡكُمۡ كَمَآ اَرۡسَلۡنَآ اِلٰى فِرۡعَوۡنَ رَسُوۡلاً ۝ (سورۃ المزمّل : ۱۵)	ہم نے بھیج دیا ہے تمہارے پاس ایک رسُول گواہ بنا کر تم پر جیسے کہ ہم نے بھیجا تھا ایک رسول فرعون کی جانب!
۲۔ لِيَكُوۡنَ الرَّسُوۡلُ شَهِيۡدًا عَلَيۡكُمۡ وَتَكُوۡنُوۡا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ ۚ (سورۃ الحج : آخری آیت)	تاکہ ہو جائیں رسولؐ گواہ تم پر ۔ اور ہو جاؤ تم گواہ پُوری نوعِ انسانی پر!
۳۔ فَكَيۡفَ اِذَا جِئۡنَا مِنۡ كُلِّ اُمَّةٍۢ بِشَهِيۡدٍ وَّجِئۡنَا بِكَ عَلٰى هٰٓؤُلَآءِ شَهِيۡدًا۔ (سورۃ النساء : ۴۱)	تو کیا ہوگا اس وقت جبکہ ہم بلائیں گے ہر گروہ میں سے ایک گواہ۔ اور بلائیں گے آپ کو (اے نبیؐ) بطورِ گواہ ان کے خلاف!

حاصل کلام یہ ہے کہ بعثتِ انبیاء کی غرضِ اصلی اور ارسالِ رسل کا مقصدِ عمومی ہے انسانوں پر اتمامِ حجّت اور قطعِ عذر بذریعہ تبلیغ و دعوت، تلقین و نصیحت، وعظ و تذکیر اور انذار و تبشیر جن کا مجموعی حاصل ہے "شہادت علی النّاس!"

چنانچہ یہی ہے نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کی بعثت کا مقصدِ اوّلین۔ بفحوائے آیتِ قرآنی :

یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ اِنَّاۤ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّ مُبَشِّرًا وَّ نَذِیْرًاۙ وَّ دَاعِیًا اِلَی اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَ سِرَاجًا مُّنِیْرًا (سورۃ الاحزاب: ۴۵ - ۴۶)	اے نبیؐ! ہم ہی نے بھیجا ہے تمہیں بنا کر گواہ اور بشارت دینے والا اور خبردار کرنے والا اور بلانے والا اللہ کی طرف اس کے حکم سے اور روشن چراغ (ہدایت)۔

گویا معلّم و مبلّغ، مربّی و مزکّی، مُبشّر و منذِر اور داعی و شاہد کی جملہ حیثیتیں مشترک ہیں آنحضور صلّی اللہ علیہ وسلم اور جُملہ انبیاء و رُسل علیہم السّلام میں، اگرچہ اِن اعتبارات سے بھی ع "ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است" کے مصداق ہر نبی اور ہر رسول کا اپنا ایک منفرد رنگ بھی ہے اور اس گلدستے میں بھی ایک امتیازی شان اور بلند و بالا مقام ہے سیّدالاوّلین و الآخرین صلی اللہ علیہ وسلم کا اِتمام بحیثیت خاتم النبیّین و آخر المرسلین جن پر نبوّت و رسالت کا اختتام ہی نہیں اِتمام و اکمال بھی ہوا ہے۔ آپؐ کے مقصدِ بعثت کی امتیازی شان کچھ اور ہی ہے جس کا بیان آگے آئیگا!

بعثتِ محمدّی

علیٰ صاحبہا الصّلوٰۃ والسّلام

کی اتمامی و تکمیلی شان

نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے مقصدِ بعثت کی امتیازی شان کے بیان میں جو الفاظ قرآنِ حکیم میں تین مقامات[۱] پر وارد ہوئے ہیں وہ یہ ہیں :

هُوَ الَّذِیۡۤ اَرۡسَلَ رَسُوۡلَهٗ بِالۡهُدٰی وَدِیۡنِ الۡحَقِّ لِیُظۡهِرَهٗ عَلَی الدِّیۡنِ كُلِّهٖ

اور یہ بات نہایت اہم ہے کہ یہ الفاظ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکر میں قرآن مجید میں تین بار اس شان کے ساتھ وارد ہوتے ہیں کہ ان میں ایک شوشے کا بھی فرق نہیں ہے جبکہ پورے قرآنِ مجید میں یہ الفاظ کسی دوسرے نبی یا رسول کے لیے ایک بار بھی استعمال نہیں ہوئے۔

اِن الفاظِ مبارکہ پر امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے اپنی مشہور تالیف "اِزالۃُ الخفاء عن خِلافۃِ الخُلفاء" میں مفصّل کلام کیا ہے اور انہیں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مقصدِ بعثت کی تعیین کے ضمن میں مرکزی اہمیت کا حامل قرار دیا ہے۔ اسی طرح مولانا عبید اللہ سندھی مرحوم نے بھی ان الفاظ کو بین الاقوامی اسلامی انقلاب کا عنوان قرار دیا ہے۔ بہرنوع آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے اِتمامی اور تکمیلی مقصد کے فہم کے لیے

---

[۱] سورۃ التوبہ : ۳۳، سورۃ الفتح : ۲۸ ، اور سورۃ الصّف : ۹ - ترجمہ : وہی ہے (اللہ) جس نے بھیجا اپنے رسول (محمدؐ) کو الہدیٰ اور دینِ حق کے ساتھ تاکہ غالب کر دے اُسے کُل دین پر۔

اِن الفاظِ مبارکہ پر غور و تدبّر لازمی ہے۔

اِن الفاظ پر توجّہ مرکوز کیجیے تو سب سے پہلی بات جو سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دو چیزیں دے کر بھیجا گیا ایک[1] "الہدٰی" اور دوسرے[2] "دینِ حق"۔

"الہدٰی"

"الہدٰی" کو وسیع لُغوی مفہوم پر رکھیے تب بھی بات غلط نہ ہوگی لیکن نظائرِ قرآنی کی مدد سے اس کی مراد کے تعیّن کی کوشش کی جائے تو وہ ہے "قرآنِ حکیم"۔ اس لیے کہ وہی "هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ"[1] بھی ہے اور "هُدًى لِّلنَّاسِ"[2] بھی۔ اور اسی کی شان میں یہ الفاظ بھی وارد ہوئے ہیں کہ "وَلٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِيْ بِهٖ مَنْ نَّشَآءُ مِنْ عِبَادِنَا"[3] اور یہ بھی کہ "اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَهْدِيْ لِلَّتِيْ هِيَ اَقْوَمُ"[4] اور وہی ہے کہ جسے جنّوں کے ایک گروہ نے سُنا تو فوراً پکار اُٹھے کہ "اِنَّا سَمِعْنَا قُرْاٰنًا عَجَبًا يَّهْدِيْٓ اِلَى الرُّشْدِ فَاٰمَنَّا بِهٖ"[5]

مزید برآں سورۃ الحدید کی آیت ۲۵ میں 'ارسالِ رُسل' کے ضمن میں فرمایا کہ:

لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا	ہم نے بھیجا اپنے رسُولوں کو واضح
بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ	تعلیمات اور روشن نشانیوں

---

[1] سورۃ البقرہ: آیت ۲ "ہدایت پرہیزگاروں کے لیے"۔

[2] سورۃ البقرہ: آیت ۱۸۵ "ہدایت پوری نوعِ انسانی کے لیے"۔

[3] سورۃ الشوریٰ: آیت ۵۲ "لیکن بنا دیا ہم نے اُسے روشنی، ہدایت دیتے ہیں اس کے ذریعے جسے چاہیں اپنے بندوں میں سے"

[4] سورۃ بنی اسرائیل: آیت ۹ "یقیناً یہ قرآن راہ دکھاتا ہے وہ جو سب سے سیدھی ہے"۔

[5] سورۃ الجنّ: آیت ۱-۲ "ہم نے سُنا ایک قرآن بہت اچھا، جو ہدایت دیتا ہے بھلائی کی طرف تو ہم ایمان لے آئے اُس پر"۔

الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ۔ — کے ساتھ اور اُتاری اُن کے ساتھ کتاب اور میزان۔

ظاہر ہے کہ اس آیۂ مبارکہ میں جس طرح "الْمِيْزَان" کو "دِيْنِ الْحَق" کے قائم مقام کی حیثیت حاصل ہے اسی طرح "الْكِتٰب" ٹھیک اس مقام پر وارد ہوا ہے جہاں آیۂ زیرِبحث میں "الْهُدٰى" کا لفظ آیا ہے۔ گویا "الْهُدٰى" سے مراد بعثتِ محمدیؐ کے ضمن میں سوائے "الْقُرْاٰن" کے اور کچھ نہیں۔ (واضح رہے کہ سورۃ الحدید 'اُمّ المُسَبِّحات' کا درجہ رکھتی ہے۔ اور اس کی اسی ایک آیت کی شرح کی حیثیت رکھتی ہے پوری سُورۃ الصّف جس کی مرکزی آیت وہی ہے جس میں زیرِبحث الفاظِ مبارکہ وارد ہوئے ہیں)

"دِین الحق" اسی طرح "دِينِ الْحَق" کو بھی خواہ ظاہری ترکیبِ اضافی پر محمول کر لیا جائے گویا اس کا ترجمہ کیا جائے "حق کا دین" خواہ اُسے ترکیبِ توصیفی بشکلِ ترکیبِ اضافی مان کر ترجمہ کر لیا جائے "سچّا دین" (جیسا کہ اکثر مترجمین نے کیا ہے!) معنیٰ و مراد کے اعتبار سے کوئی فرق واقع نہیں ہوتا جو بہرصورت ایک ہی ہیں یعنی "اللہ کا دین" اس لیے کہ سچّا دین سوائے اللہ کے اور کس کا ہو سکتا ہے اور ذاتِ حق بھی ذاتِ باری سبحانہٗ و تعالیٰ کے سوا اور کس کی ہے ؟ بفحوائے آیاتِ قرآنی :

۱۔ ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ (سورۃ الحج : ۶، ۶۲) — یہ اس لیے کہ ایک اللہ ہی تو ہے "حق"۔ (یعنی کامل حق یا سراپا حق)

۲۔ وَيَعْلَمُوْنَ اَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ الْمُبِيْنُ (سورۃ النور : ۲۵) — اور وہ خوب جانتے ہیں کہ صرف اللہ ہی ہے کھُلا "حق"۔

گویا "دِينِ الْحَق" بالکل مساوی و مترادف ہے "دِينِ اللّٰه" کے! اور عجیب بات ہے کہ قرآنِ حکیم میں تین ہی بار آیتِ زیرِبحث کے ضمن میں دِینِ الحقّ کی ترکیب استعمال ہوئی ہے

اور پورے قرآن میں ٹھیک تین ہی مرتبہ دین اللہ کے الفاظ وارد ہوئے ہیں[1]! لفظ "دین" پر توجہ کو مرکوز کیجیے تو عربی لغت میں اس کا اساسی مفہوم بالکل وہی ہے جس میں یہ لفظ "اساس القرآن" یعنی سورۃ فاتحہ کی تیسری آیت میں مستعمل ہوا ہے یعنی بدلہ[2] (جو لامحالہ نیکی کا جزا کی صورت میں ہوگا اور بدی کا سزا کی شکل میں[3])

چنانچہ قرآن حکیم کی ابتدائی سورتوں میں یہ لفظ بغیر کسی اضافی یا توصیفی ترکیب کے اپنی سادہ ترین صورت میں بدلے اور جزاء وسزا ہی کے معنی میں استعمال ہوا ہے جیسے:

۱۔	أَرَءَيْتَ الَّذِي يُكَذِّبُ بِالدِّينِ۔ (سورۃ الماعون: ۱)	تم نے دیکھا اسے جو جھٹلاتا ہے جزا وسزا کو؟
۲۔	فَمَا يُكَذِّبُكَ بَعْدُ بِالدِّينِ۔ (سورۃ التین: ۷)	تو اس کے بعد کیا چیز آمادہ کرتی ہے تجھے جزا وسزا کے جھٹلانے پر؟
۳۔	كَلَّا بَلْ تُكَذِّبُونَ بِالدِّينِ۔ (سورۃ الانفطار: ۹)	کوئی نہیں، بلکہ تم جھٹلاتے ہو جزا و سزا کو!

اور سورۃ الفاتحہ کے علاوہ مختلف مقامات پر بارہ مرتبہ آیا ہے یہ لفظ 'یوم' کی اضافت کے

---

[1] سورۃ آل عمران: آیت ۸۳، سورۃ النور: آیت ۲، سورۃ النصر: آیت ۲۔

[2] یہاں چاہیں تو عربی کی کہاوت "كَمَا تَدِينُ تُدَانُ" (جیسا کروگے ویسا بھروگے) اور دیوانِ حماسہ کے مشہور مصرعہ کے الفاظ ؏ دِنَّا هُمْ كَمَا دَانُوا " (ہم نے اُن کے ساتھ وہی کچھ کیا جو انہوں نے ہمارے ساتھ کیا تھا) بھی ذہن میں مستحضر کرلیں اور اسے بھی کہ عربی میں 'دَین' کہتے ہیں قرض کو جس کا لوٹایا جانا لازم ہوتا ہے۔

[3] جیسا کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "ثُمَّ لَتُجْزَوُنَّ بِالْإِحْسَانِ إِحْسَانًا وَبِالسُّوءِ سُوءً"! (پھر لازماً تمہیں بدلہ دیا جائے گا بھلائی کا بھلا اور بُرائی کا بُرا!)

ساتھ یومِ قیامت کے معنی میں یعنی بدلے یا جزاء و سزا کا دن !

پھر چونکہ بدلے اور جزاء و سزا کا تصوّر لازماً متلزم ہے کسی قانون اور ضابطے اور اُس کی اطاعت و متابعت کے تصوّر کو، لہٰذا لفظِ ' دین ' نے بھی جب اپنی اصل لغوی اساس سے اُٹھ کر قرآنی اصطلاح کی صورت اختیار کی تو اس میں اوّلاً ' اطاعت ' کا مفہوم پیدا ہوا۔ چنانچہ قرآنِ حکیم میں دو مرتبہ " مُخۡلِصًا لَّهُ الدِّيۡنَ " اور ایک بار " مُخۡلِصًا لَّهٗ دِيۡنِىۡ " اور چھ مرتبہ " مُخۡلِصِيۡنَ لَهُ الدِّيۡنَ " کے الفاظ اطاعت اور بندگی و فرمانبرداری کو اللہ تعالیٰ کے لیے خالص کر لینے ہی کے مفہوم میں آئے ہیں جن میں مزید زور اور تاکید کے لیے کہیں کہیں اضافہ کیا جاتا ہے " حَنِيۡفًا " یا " حُنَفَاءَ " کے الفاظ کا۔ اور یہی مفہوم ہے قرآنِ حکیم کے ان الفاظِ مبارکہ کا کہ: " اَلَا لِلّٰهِ الدِّيۡنُ الۡخَالِصُ " (سورۃ الزمر: ۳) اور " وَلَهُ الدِّيۡنُ وَاصِبًا " (سورۃ النحل ۵۲) — اور بالآخر اس نے ' نظامِ اطاعت ' کی صورت اختیار کر لی۔ جس کی اضافتِ حقیقی تو اس ذات کی طرف ہوتی ہے جسے مطاع مان کر نظامِ زندگی کا تفصیلی ڈھانچہ اور ضابطہ تیار کیا گیا ہو جیسے سورۃ یوسف میں فرمایا:

كَذٰلِكَ كِدۡنَا لِيُوۡسُفَ ؕ مَا	اس طرح ہم نے تدبیر کر دی
كَانَ لِيَاۡخُذَ اَخَاهُ فِىۡ	یوسفؑ کے لیے ورنہ بادشاہ کے
دِيۡنِ الۡمَلِكِ۔	قانون کی رُو سے وہ مجاز نہ تھے کہ اپنے
(سورۃ یوسف: آیت ۷۶)	بھائی کو روک سکتے۔

گویا مصر کے اس دَور کے رائج الوقت نظامِ ملوکیّت کو جس میں مطاعِ مطلق کی حیثیّت بادشاہ یا ' مَلِک ' کو حاصل تھی قرآنِ حکیم " دین الملک " سے تعبیر کرتا ہے۔ اور ٹھیک اسی مفہوم (SENSE) میں قرآن مجید نے استعمال کیے ہیں " دِيۡنِ اللّٰه " کے الفاظ سورۃ النّصر میں:

اِذَا جَآءَ نَصۡرُ اللّٰهِ وَالۡفَتۡحُ ۙ	جب آ گئی اللہ کی مدد اور فتح

وَرَأَیْتَ النَّاسَ یَدْخُلُوْنَ   اور دیکھ لیا تم نے لوگوں کو داخل ہوتے
فِیْ دِیْنِ اللّٰہِ اَفْوَاجًا ہوئے اللہ کے دین میں فوج در فوج۔

گویا آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بیس سال سے زائد جدوجہد کے نتیجے میں جب عرب میں یہ صورتِ حال پیدا ہو گئی کہ اللہ ہی کو مطاعِ مطلق مان لیا گیا اور لوگ جوق در جوق اور گروہ در گروہ اس کے نظامِ اطاعت میں داخل ہوتے چلے گئے تو اسے قرآن مجید نے "دِینِ اللّٰہ" کے الفاظ سے تعبیر کیا ——— (اور اس اعتبار سے دیکھا جائے تو ہرگز غلط نہ ہوگا اگر دورِ جدید کے محبوب و مقبول طرزِ حکومت یعنی جمہوریت کو جس میں غلط یا صحیح بہر حال نظری طور پر[1] حاکمیت کے حامل قرار دیئے جاتے ہیں جمہور تعبیر کیا جائے 'دِیْنُ الْجُمْہُوْر' کے الفاظ سے!)

البتہ قرآنِ حکیم میں 'دین' کی ایک دوسری نسبت و اضافت بھی بکثرت وارد ہوئی ہے جسے اضافتِ مجازی قرار دیا جانا چاہیے جیسے "دِیْنِیْ" یا "دِیْنُکُمْ" یا "دِیْنَہُمْ"۔ یہ اس اعتبار سے ہے کہ انسان نے جس نظامِ اطاعت کو قبول کر لیا ہو یا جس کے تحت وہ زندگی گزار رہا ہو وہ گویا 'اُس کا دین' بن گیا۔ (اسی مجازی نسبت کی مثال ہے اس مشہور دُعا کے الفاظ میں: اَللّٰھُمَّ انْصُرْ مَنْ نَصَرَ دِیْنَ مُحَمَّدٍ.... الخ اسلام اصلاً تو 'دین اللّٰہ' ہے لیکن مجازاً 'دین مُحَمَّد' بھی ہے۔ اس اعتبار سے بھی کہ اس دین کے لانے والے وہی ہیں، فِدَاہُ اٰبَاءُنَا وَاُمَّھَاتُنَا۔)

حاصلِ کلام یہ کہ "دِیْنُ الْحَقّ" سے مراد ہے "دِیْنُ اللّٰہ" یعنی وہ نظامِ زندگی جو اللہ تعالیٰ کی اطاعتِ کُلّی و مطلقہ کی بنیاد پر قائم ہو اور یہ در اصل خاتم النبیّین و آخر المرسلین

---

[1] بقول علامہ اقبال مرحوم ؎

دیوِ استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب   تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری!

صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا شدہ اتمامی و تکمیلی صورت ہے اس "اَلْمِیْزَان" کی جو تاریخ انسانی کے مختلف ارتقائی مراحل پر قدرے مختلف صورتوں میں عطا ہوتی رہی تھی سابق رسولوں کو، عَلٰی نَبِیِّنَا وَعَلَیْھِمُ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَام! ـــــــ اور اس اعتبار سے اس کی حیثیت ہے اس 'نظامِ عدلِ اجتماعی' کی جس میں ہر ایک کے حقوق و فرائض کا صحیح صحیح تعین کر دیا گیا ہے۔ "تاکہ لوگ قائم رہیں اس نظامِ قسط پر"[1]

آخری بعثت کے لیے وقت کی تعیین و انتخاب میں حکمت

مزید غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ختمِ نبوت، اتمامِ نعمتِ شریعت اور تکمیلِ دینِ حق کے لیے وقت کے انتخاب میں جو حکمتِ الٰہی کارفرما ہے اس کی جانب بھی انہی دو الفاظ سے رہنمائی ملتی ہے۔ اس لیے کہ بعثتِ محمدی علیٰ صاحبہا الصَّلٰوۃ والسَّلام کا زمانہ نوعِ انسانی کی تاریخ کا وہ دور ہے جس میں دو ہی اعتبارات سے نسلِ انسانی گویا عہدِ طفولیت سے نکل کر بلوغ کو پہنچی تھی:

۱۔ ایک اس اعتبار سے کہ عقلِ انسانی اپنی پختگی کو پہنچ گئی تھی اور انسان بحیثیت انسان جو کچھ سوچ سکتا تھا سوچ چکا تھا۔ یا یوں کہہ لیں کہ نسلِ انسانی عقلی و فکری اعتبار سے بالغ ہو گئی تھی۔ محترم پروفیسر یوسف سلیم چشتی مرحوم و مغفور جنہوں نے مذاہبِ عالم، فلسفہ، تصوّف اور علمِ کلام کا نہایت وسیع مطالعہ کیا، گواہی دیتے ہیں کہ تاریخ انسانی کے بارہ سو سال یعنی چھ سو سال قبل مسیح سے چھ سو سال بعد مسیحؑ تک کا عرصہ فکرِ انسانی کے عہدِ طفولیت سے نکل کر عقل و شعور کی پختگی تک پہنچنے کا زمانہ ہے۔ چنانچہ اس عرصے کے دوران میں تمام مذاہبِ عالم بھی پیدا ہو چکے تھے اور تمام مکاتبِ فلسفہ بھی وجود میں آ چکے تھے۔ اس کے بعد مادّی علوم نے ضرور ترقی کی ہے اور انسانی معلومات کا دائرہ یقیناً نہایت وسیع ہوا ہے

---

[1] "لِیَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ" (سورۃ الحدید: ۲۵)

لیکن فکر کے میدان میں ہرگز کوئی ترقی نہیں ہوئی۔ چنانچہ نہ کوئی واقعۃً نیا مذہب وجود میں آیا ہے نہ حقیقۃً جدید مکتبِ فکر یا مدرسۂ فلسفہ۔ اور فلسفۂ جدید کے نام سے بھاری بھرکم عنوانات اور اصطلاحات کے ساتھ جو مکاتبِ فکر سامنے آئے ہیں اُن کی حیثیت نئی بوتلوں میں پرانی شراب کے سوا اور کچھ نہیں ——— اب اگر یہ صحیح ہے اور یقیناً صحیح ہے تو صاف سمجھ میں آتا ہے کہ ساتویں صدی عیسوی ہی موزوں و مناسب تھی اس کے لیے کہ ع "نوعِ انساں را پیامِ آخریں" یعنی قرآنِ حکیم "الھدیٰ" بنا کر نازل کر دیا جاتا اور اُس کی ابدالآباد تک حفاظت کا اہتمام و انتظام بھی کر دیا جاتا کہ نوعِ انسانی کی فکری رہنمائی کا مستقل سامان ہو جاتے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآنِ حکیم ان دعاوی کے ساتھ نازل ہوا کہ:

۱۔ اِنَّ ھٰذَا الْقُرْاٰنَ یَھْدِیْ لِلَّتِیْ ھِیَ اَقْوَمُ (سورۃ الاسراء: ۹)
یقیناً یہ قرآن رہنمائی کرتا ہے اس راہ کی طرف جو سب سے سیدھی ہے۔

۲۔ وَبِالْحَقِّ اَنْزَلْنٰہُ وَبِالْحَقِّ نَزَلَ ؕ (سورۃ الاسراء: ۱۰۵)
اور اس (قرآن) کو ہم نے حق ہی کے ساتھ نازل فرمایا۔ اور حق ہی کے ساتھ وہ نازل ہوا۔

۳۔ قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰٓی اَنْ یَّاْتُوْا بِمِثْلِ ھٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا یَاْتُوْنَ بِمِثْلِہٖ وَلَوْ کَانَ بَعْضُھُمْ لِبَعْضٍ ظَھِیْرًا ۝ (سورۃ الاسراء: ۸۸)
کہہ دو کہ اگر مجتمع ہو جائیں تمام انسان اور تمام جنّ اس پر کہ لے آئیں اس جیسا قرآن تو نہ لا پائیں گے اس کا مثل خواہ وہ سب ایک دوسرے کے لیے مددگار اور حمایتی بن جائیں۔

اور اُس نے پوری نوعِ انسانی کو بار بار چیلنج کیا کہ:

وَاِنْ کُنْتُمْ فِیْ رَیْبٍ مِّمَّا
اور اگر ہو تم شک میں اس

نَزَّلْنَا عَلٰی عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ۔ (سورۃ البقرۃ : ۲۳)

کے بارے میں جو نازل فرمایا ہے ہم نے اپنے بندے پر تو لے آؤ اس جیسی ایک ہی سورۃ !

افسوس کہ تاحال قرآنِ حکیم کے وجوہِ اعجاز میں سے اصل توجّہ صرف اُس کے ادبی و لغوی محاسن اور انداز و اسلوب کی مٹھاس گویا فصاحت و بلاغت ہی پر صَرف کی جاتی رہی ہے اور ساری بحث الفاظ کی موزونیّت، تراکیب کی چستی اور اصوات کے آہنگ ہی کے گِرد گھومتی رہی ہے ــــــ اور اس کے فکر کی جانب کوئی توجّہ ہوئی بھی ہے تو نہایت بھونڈے انداز میں بایں طور کہ کبھی ارسطو کی منطق کو اس پر حاکم بنا کر لا بٹھایا گیا اور کبھی جدید سائنسی نظریات کی بیڑیاں اُس کے قدموں میں ڈال دی گئیں درآں حالیکہ ابھی وہ خود نہایت خام اور ناپختہ حالت میں تھے۔

واضح رہنا چاہیے کہ قرآن اصلاً "اَلْھُدٰی" ہے اور اس کا اصل اعجاز اس کی 'فکری و عملی رہنمائی' ہی میں مضمر ہے اور یہ انسان کو اس وقت عطا کیا گیا جب فکرِ انسانی بطورِ خود (AS SUCH) اپنی آخری بلندیوں کو چھو چکی تھی! گویا انسان عقلی اور فکری اعتبار سے 'بالغ' ہو گیا تھا!

۲۔ آخری بعثت کے لیے وقت کے انتخاب میں دُوسرا پہلو جو سامنے آتا ہے وہ یہ ہے کہ ساتویں صدی عیسوی تک انسان کا اجتماعی شعور بھی پختہ ہو چکا تھا اور انسان کی ہیئتِ اجتماعیہ بھی ارتقاء کے جُملہ مراحل طے کر کے گویا اپنے عرُوج کو پہنچ چکی تھی۔ چنانچہ انسان اوّلاً قبائلی زندگی اور اُس کے بعد شہری ریاستوں (CITY STATES) کے قیام کے مراحل طے کر چکا تھا اور عظیم سلطنتوں کے دَور کا آغاز ہو چکا تھا۔ گویا حیاتِ انسانی پر نظامِ اجتماعی کی گرفت پوُری شدّت کو پہنچ چکی تھی، اور انسان کو تمدّن و اجتماعیّت کے نازک اور پیچ در پیچ مسائل سے سابقہ پیش آ چکا تھا۔ مزید برآں اب اُس دَور کا آغاز ہونے والا تھا جس میں

فرد بمقابلہ جماعت، مرد بمقابلہ عورت اور سرمایہ بمقابلہ محنت ایسے پیچیدہ اور لاینحل مسائل کے ضمن میں انسان کی عقلی ٹھوکروں اور فکری بے اعتدالیوں کے طفیل عالمِ انسانیّت کو موت و حیات کی شدید کشمکش اور TO BE OR NOT TO BE کی سی اذیت بخش کیفیّت سے دوچار ہونا تھا ـــــ لہٰذا یہی موزوں وقت تھا کہ انسان کو ایک ایسا نظامِ عدلِ اجتماعی، عطا کر دیا جائے جو واقعتہً "اَلْمِیْزَان" کے حکم میں ہو اور تمدّن و اجتماعیّت کے جملہ نازک اور پیچیدہ مسائل میں مختلف پہلوؤں سے راہِ وَسَط کا تعیّن کر دے اور معاشرت، معیشت اور سیاست تینوں کے ضمن میں صراطِ مستقیم اور سواءُ السّبیل کو پُوری طرح واضح کر دے تاکہ نہ معاشرتی بے راہ روی (SOCIAL PERVERSION) کا کوئی امکان باقی رہے نہ معاشی استحصال (ECONOMIC EXPLOITATION) کا اور نہ سیاسی جبر (POLITICAL REPRESSION) کا۔ اور ارسالِ رُسل اور انزالِ کتاب و میزان کا جو مقصد ہمیشہ سے پیش نظر تھا یعنی "لِیَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ" وہ نبی آخر الزّماں صلی اللہ علیہ وسلم پر تکمیلِ دینِ حق کے ذریعے ابدالآباد تک کے لیے پُورا ہو جائے، بفحوائے آیتِ قرآنی:

اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ	آج کے دن میں نے کامل کر دیا
وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَ	تمہارے لیے تمہارا دین اور پُوری کر
رَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًاط	دی تم پر اپنی نعمت اور پسند کر لیا میں
(سورۃ المائدہ: ۳)	نے تمہارے لیے دین اسلام کو۔

لِیُظْھِرَہٗ

اب ایک قدم اور آگے بڑھائیے اور 'لِیُظْھِرَہٗ' پر غور فرمائیے۔ تو بحمد اللہ یہاں 'اظہار' کے معنی تو متفق علیہ ہیں یعنی 'غالب کر دینا' البتّہ یہاں فعلِ اظہار کے فاعل و مفعول دونوں کے بارے میں ایک سے زائد رائیں موجود ہیں اگرچہ اُن سے مُراد و معنیٰ میں کوئی حقیقی و واقعی فرق واقع نہیں ہوتا۔ چنانچہ ایک رائے یہ ہے کہ یہاں فعلِ اظہار کا فاعل بھی وہی ہے جو فعلِ ارسال کا ہے یعنی اللہ تعالیٰ اور دُوسری

(حاشیہ اگلے صفحے پر)

رائے یہ ہے کہ 'لِیُظْهِرَهٗ' میں ضمیرِ فاعلی رسول کی جانب راجع ہے۔ اس معاملے میں اس اصول سے قطع نظر کہ ضمیر کا مرجع اگر قریب موجود ہو تو دُور جانا صحیح نہیں اِلّا آنکہ کوئی خاص قرینہ موجود ہو، سوال یہ ہے کہ اس سے فرق کیا واقع ہوتا ہے؟ ہمارا ایمان ہے کہ فاعلِ حقیقی تو اللہ تعالیٰ کے سوا اور کوئی ہے ہی نہیں۔ اس کے باوجود عالمِ واقعہ میں قرآنِ حکیم کے جملہ اوامر و نواہی کے مخاطب انسان ہی ہیں۔ اور انہی کو دین کے تمام مقاصد کی تکمیل کے لیے اپنا خون پسینہ ایک کرنا لازم ہے۔ چنانچہ اظہارِ دینِ حق کے لیے عالمِ واقعہ میں بالفعل سعی و جہد اور شدید محنت و مشقّت آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی نے کی اگرچہ فاعلِ حقیقی تو ہر آن اللہ ہی ہے بفحوائے آیتِ قرآنی :

فَلَمْ تَقْتُلُوْهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ	تو نہیں (کفّارِ قریش کو) تم نے قتل نہیں کیا بلکہ
قَتَلَهُمْ وَمَا رَمَيْتَ اِذْ	اللہ نے کیا اور (اے نبیؐ) جب تم نے اُن پر
رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى ج	خاک پھینکی تو تم نے نہیں پھینکی تھی (وہ مُشتِ خاک)
(سورۃ الانفال : ۱۷)	بلکہ اللہ نے پھینکی تھی !

کاش کہ وہ لوگ جو تاویل کے اس بودے اور کمزور سے اختلاف کو پہاڑ بنا کر اپنے دینی فرائض کے پُورے تصوّر ہی کو مسخ کر رہے ہیں اور بزعمِ خویش اس دلیل کی بنیاد پر فریضۂ اظہارِ دینِ حق ہی سے بری ہو بیٹھے ہیں وہ غور کرتے کہ غزوۂ بدر کے بعد جب آیتِ متذکرہ

حاشیہ صفحہ گذشتہ

لہ 'ظهر' کہتے ہیں پیٹھ کو ——— اور 'ظاهر' استعارۃً غالب کے معنی میں بھی مستعمل ہے جیسے قرآن مجید میں سورۃ الصّف کے آخر میں "فَاَصْبَحُوْا ظٰهِرِيْنَ" (پس وہی ہوئے غالب!) اس لیے کہ جو کسی کی پیٹھ پر سوار ہو وہ یقیناً اس پر قابو یافتہ ہے اور غلبہ رکھتا ہے' اور عیاں کے معنیٰ میں بھی اس لیے کہ راکب مرکب کی نسبت لازماً نمایاں تر ہوتا ہے! 'اِظْهَار' بابِ افعال سے مصدر ہے اور اس میں فعلِ متعدّی کا مفہوم پیدا ہو گیا ہے۔ یعنی ظاہر کر دینا یا غالب کر دینا۔

بالا نازل ہوئی اگر آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین اسے ظاہر الفاظ پر محمول کرتے ہوتے آئندہ کے لیے سعی و جہد سے دستکش ہو کر بیٹھ رہتے تو تاریخ کا دھارا کس رُخ بہتا ہے اور آیا اس صورت میں ہم میں سے کوئی ایک بھی دولتِ ایمان اور نعمتِ اسلام سے بہرہ ور ہو سکتا ہے غور کرنا چاہیے کہ کہیں ہم شیطان کے فریب میں تو نہیں آ گئے ہے اور صورتحال وہ تو نہیں جو "خوئے بدرا بہانہ بسیار!" کی کہاوت میں بیان ہوتی یا جگر مراد آبادی کے اس شعر میں کہ :ـــ

تپتی راہیں مجھ کو پکاریں دامن پکڑے چھاؤں گھنیری!

اگر صفائے نیت کے ساتھ حقیقت کو جاننے اور سمجھنے کی کوشش کی جائے تو معاملہ بالکل صاف ہے۔ سورۃ التّوبہ، سورۃ الفتح اور سورۃ الصّف جن میں آیت زیرِ بحث وارد ہوئی ہے تینوں اللہ کی راہ میں جہاد اور قتال سے تفصیلاً بحث کرتی ہیں۔ خصوصاً سورۃ الصّف تو از اوّل تا آخر ہے ہی جہاد و قتال فی سبیل اللہ کے موضوع پر۔ اور اس میں اس آیۂ مبارکہ یعنی: هُوَ الَّذِيٓ اَرۡسَلَ رَسُوۡلَهٗ بِالۡهُدٰى وَ دِيۡنِ الۡحَـقِّ لِيُظۡهِرَهٗ عَلَى الدِّيۡنِ كُلِّهٖ وَلَوۡ كَرِهَ الۡمُشۡرِكُوۡنَ ۝ کے فوراً بعد مسلمانوں کے جذبۂ جہاد و قتال کو للکارا گیا ہے۔ بایں طور کہ پہلے سوال کیا گیا کہ عذابِ جہنّم سے چھٹکارا پانے کے طالب ہو یا نہیں ہے اور پھر صاف صاف سنا دیا گیا کہ اس کی ایک ہی راہ ہے اور وہ جہاد و قتال فی سبیل اللہ کی کٹھن اور پُر صعوبت وادیوں سے ہو کر گزرتی ہے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا هَلۡ	اے اہلِ ایمان! کیا میں رہنمائی
اَدُلُّكُمۡ عَلٰى تِجَارَةٍ تُنۡجِيۡكُمۡ	کروں تمہاری ایسے کاروبار کی جانب
مِّنۡ عَذَابٍ اَلِيۡمٍ ۝ تُؤۡمِنُوۡنَ	جو چھٹکارا دلادے تمہیں دردناک عذاب
بِاللّٰهِ وَرَسُوۡلِهٖ وَتُجَاهِدُوۡنَ	سے ہے ایمان (محکم) رکھو اللہ تعالیٰ پر اور اس کے
فِىۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ بِاَمۡوَالِكُمۡ	رسولؐ پر اور جہاد کرو اسی کی راہ میں اور

وَاَنْفُسِكُمْ (سورة الصّف : ۱۰، ۱۱) کھپاؤ اس میں اپنے مال بھی اور اپنی جانیں بھی۔

اگر اس راہ کو اختیار کرتے ہو تو مغفرت کا وعدہ بھی ہے اور جنّت کا بھی، اُخروی فوز و فلاح کا وعدہ بھی ہے اور دنیا میں تائید اور فتح و نصرت کا بھی، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ نصرتِ خدا اور رسولؐ کے بلند و بالا مقام پر فائز ہونے کا امکان بھی ہے اور محبوبیتِ خداوندی کے اعلیٰ مرتبے پر بھی —— بصورتِ دیگر یہ مقاماتِ بلند تو خارج از بحث ہیں ہی، عذابِ الیم سے چھٹکارا پانا بھی اُمیدِ موہوم کے سوا کچھ نہیں!

گویا بات بالکل سیدھی ہے کہ دین اصلاً اللہ کا ہے اور اس کو غالب کرنا اصلاً فرضِ منصبی ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا۔ اب جو ان دونوں پر ایمان کے دعویدار ہوں اُن کے خلوص و اخلاص کا اصل امتحان (TEST) یہ ہے کہ اگر اپنا تن من دھن اس کام میں کھپا کر اللہ اور رسولؐ دونوں کے مددگار ہونے کا مرتبہ حاصل کرلیں تو کامیاب و کامران ہیں ورنہ خائب و خاسر اور ناکام و نامراد!!

چنانچہ سورۃ الحدید کی آیت نمبر ۲۵ کے آخر میں بھی وضاحت فرما دی:

وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ اور تا کہ دیکھ لے اللہ کہ کون مدد کرتا ہے
وَرُسُلَهٗ بِالْغَيْبِ ط اُس کی اور اس کے رسولوں کی غیب کے باوجود

اور سورۃ الصّف کا اختتام بھی ہوا اس آیۂ مبارکہ پر!

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْٓا اے اہل ایمان! بنو مددگار اللہ کے
اَنْصَارَ اللّٰهِ كَمَا قَالَ عِيْسَى جیسے کہ کہا تھا عیسیٰ ابن مریم نے اپنے
ابْنُ مَرْيَمَ لِلْحَوَارِيّٖنَ مَنْ حواریوں سے کہ کون ہے میرا مددگار
اَنْصَارِيْٓ اِلَى اللّٰهِ ط اللہ کی طرف!

اس کے بعد بھی اگر کوئی نہ سمجھنا چاہے تو اس کی مرضی۔

لِيُظْهِرَهٗ کی ضمیرِ مفعولی کے بارے میں بھی دو رائیں ہیں: ایک یہ کہ اس کا مرجع

ہے دین الحق اور دوسری یہ کہ یہ راجع ہے رسولؐ کی جانب ——— اگرچہ اس سے بھی ہرگز کوئی فرق واقع نہیں ہوتا اس لیے کہ رسولؐ کے غلبے کا مطلب بھی اُن کی ذات یا اُن کے کنبے اور قبیلے کا غلبہ نہیں دینِ حق ہی کا غلبہ ہے۔

علی الدّینِ کلِّہٖ

"علی الدّین کُلِّہٖ" کا ترجمہ اکثر و بیشتر مترجمین نے "تمام ادیان پر" کیا ہے۔ گویا "الدّین" کے لام تعریف کو لام استغراق قرار دیا ہے۔ حالانکہ یہاں جسقدر امکان لام استغراق کا ہے اتنا ہی لام جنس کا بھی ہے، چنانچہ بعض حضرات نے اس کا ترجمہ "سب دین پر" یا "سارے دین پر" یا "کُل دین پر" یا "پورے جنس دین پر" بھی کیا ہے۔

سب جانتے ہیں کہ قرآن حکیم کے اوّلین اردو مترجمین امام الہند شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے جلیل القدر صاحبزادے شاہ رفیع الدینؒ اور شاہ عبد القادرؒ ہیں۔ ان میں سے مقدم الذکر کے ترجمے میں رعایتِ لفظی زیادہ ملحوظ ہے اور مؤخر الذکر کا ترجمہ بامحاورہ قرار دیا جاتا ہے۔ بعد کے اکثر و بیشتر مترجمین اصلاً ان دو بھائیوں ہی کے خوشہ چیں ہیں۔ چنانچہ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ نے تو اپنے ترجمۂ قرآن کے دیباچے میں صاف اعلان کیا ہے کہ اصلاً وہ شاہ عبد القادرؒ ہی کا ترجمہ ہے جس میں ایک صدی بیت جانے کے باعث اردو کے محاورے میں جو تبدیلی آگئی ہے صرف اس کے پیش نظر لفظی تبدیلی کی گئی ہے۔

شاہ عبد القادرؒ نے "علی الدّین کلِّہٖ" کا ترجمہ سورۃ التّوبہ اور سورۃ الفتح میں تو "ہر دین سے" کے الفاظ سے کیا ہے اور سورۃ الصّف میں "دینوں سے، سب سے" کے الفاظ استعمال فرمائے ہیں۔ جبکہ شاہ رفیع الدینؒ نے صرف سورۃ التّوبہ میں "اوپر دین سب کے" کے الفاظ استعمال فرمائے ہیں، اور سورۃ الفتح اور سورۃ الصّف دونوں مقامات پر "اوپر دین سارے کے" کی تعبیر اختیار کی ہے۔

گویا جہاں تک ٹھیٹھ عربی قواعد کا تعلّق ہے یہ دونوں ترجمے مساوی طور پر صحیح اور درست ہیں، البتہ اگر حسبِ ذیل حقائق کو پیشِ نظر رکھا جائے تو واضح ہو جاتا ہے کہ صحیح تر اور موزوں تر ترجمہ شاہ رفیع الدینؒ ہی کا ہے:

۱- پورے قرآنِ مجید میں نہ کہیں 'ادیان' کا لفظ استعمال ہوا ہے، نہ ہی کوئی دوسرا مقام ایسا ہے جہاں "الدین" کا ترجمہ "تمام ادیان" کرنا ممکن ہو۔

۲- تفسیرِ قرآن کے اہم اصول "القرآن یفسّر بعضہٗ بعضاً" کے پیشِ نظر اس معاملے میں یہ حقیقت تو انتہائی فیصلہ کُن اہمیّت کی حامل ہے کہ "الدّین" کے ساتھ "کُلّہ" کا تاکیدی کلمہ ان تین آیات کے علاوہ پورے قرآن میں صرف حسبِ ذیل آیۂ مبارکہ میں وارد ہوا ہے:

وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَاتَكُوْنَ	اور جنگ کرتے رہو اُن سے یہاں تک
فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ ۚ	کہ فتنہ بالکل فرو ہو جائے اور دین کُل
(سورۃ الانفال: ۳۹)	کا کل اللہ ہی کے لیے ہو جائے۔

اور یہاں ظاہر ہے کہ "سارے ادیان" کا ترجمہ قطعاً ممکن نہیں ہے۔ بلکہ صرف ایک ہی ترجمہ ممکن ہے یعنی "پورے کا پورا دین" یا "سارے کا سارا دین" اس لیے کہ تمام ادیان کے اللہ کے لیے ہو جانے کے کوئی معنیٰ ہی نہیں ہیں جب کہ سارے کے سارے دین یا پورے کے پورے دین کا اللہ کے لیے ہونا قرآن حکیم کا ایک معروف مضمون ہے۔ (جیسا کہ اس سے قبل "مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ" اور "اَلَا لِلّٰهِ الدِّيْنُ الْخَالِصُ" اور "وَلَهُ الدِّيْنُ وَاصِبًا" کے حوالے سے تفصیلاً بیان ہو چکا ہے۔)

اب "الدّین" کے اصطلاحی معنی ذہن میں مستحضر کر کے "هُوَالَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ" کا ترجمہ کیجیے تو وہ یوں ہو گا:

"وہی ہے (اللہ) جس نے بھیجا اپنے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کو 'الھدٰی' (یعنی قرآنِ حکیم) اور دینِ حق (یعنی اللہ تعالیٰ کی اطاعتِ کُلّی کے اصول پر مبنی نظامِ زندگی

یعنی اسلام) کے ساتھ تاکہ غالب کر دے وہ (یعنی رسولؐ) اُسے (یعنی اللہ کی اطاعت کے نظام کو) پُورے کے پُورے دین (یعنی نظامِ اطاعت یا نظامِ زندگی) پر!"

اس آیۂ مبارکہ کے مفہوم و معنی کی اس تفصیلی وضاحت کے ساتھ ہی عقلی اور منطقی طور پر بھی سمجھ لیجئے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کے لیے یہ 'اِظْهَارُ دِيْنِ الْحَقِّ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ' کیوں ضروری تھا؟

اچھی طرح سمجھ لیا جانا چاہیے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلّم کے لیے یہ 'اظہارِ دینِ حق' دو وجوہات کی بنا پر لازمی و لابُدی تھا:

۱۔ ایک اس لیے کہ دین اپنی فطرت کے اعتبار ہی سے غلبہ چاہتا ہے اور وہ نظامِ اطاعت بے معنی ہے جو فی الواقع قائم و نافذ نہ ہو۔

اس اعتبار سے دین اور مذہب میں آسمان اور زمین کا سا فرق و تفاوُت ہے۔ مذہب اصلاً ایک جزوی شے ہے اور کسی بھی دین کے تحت رہ کر گذارہ کر سکتا ہے۔ جس طرح غلبۂ اسلام کے زمانے میں عیسائیّت، یہودیّت اور مجوسیت یا بُدھ مت اور ہندو مت ایسے مذاہب "يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ"[1] کی کیفیت کے ساتھ زندہ رہے یا غلبۂ انگریز کے زمانے میں اسلام ایک مذہب کی صورت اختیار کر کے زندہ رہا[2] ــــ جب کہ دین ایک کُلّی حقیقت ہے جس کے کوئی معنی ہی نہیں اگر وہ غالب نہ ہو۔ چنانچہ جس طرح دو تلواریں ایک میان میں نہیں سما سکتیں یا جمہوریّت اور ملوکیّت یا کیپٹیلزم اور کمیونزم کسی خطۂ زمین پر بیک وقت قائم نہیں ہو سکتے اسی طرح دو دین بھی کسی

---

[1] التوبۃ: ۲۹۔ "دیتے ہوئے جزیہ اپنے ہاتھ سے 'چھوٹے' ہو کر!"

[2] جس کی صحیح ترین تصویر ہے علامہ اقبالؒ کے اس شعر میں ؎

مُلّا کو جو ہے ہند میں سجدے کی اجازت ۔۔۔ ناداں یہ سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد!

جگہ ہم سر اور ہم پلّہ ہو کر نہیں رہ سکتے۔ اور ان کے مابین مفاہمت (DETENTE) یا پُر امن بقائے باہمی (PEACEFUL CO-EXISTENCE) کی کوئی صورت اس کے سوا موجود نہیں ہے کہ ان میں سے ایک تو دین ہی کی حیثیت میں رہے اور غالب ہو اور دوسرا سمٹ اور سکڑ[1] کر مذہب کی حیثیت اختیار کر لے اور مغلوب ہو کر رہنے پر راضی ہو جائے[2]!

دین و مذہب کے مابین فرق و امتیاز کے ضمن میں دو حقیقتیں اور بھی پیشِ نظر رہنی چاہئیں:

ایک[1] یہ کہ لفظ مذہب پورے قرآن حکیم میں کہیں نہیں آیا اور حدیثِ نبویؐ کے پورے ذخیرے میں بھی یہ لفظ عام معروف اصطلاحی معنوں میں کہیں مستعمل نہیں ہوا۔ بعد میں بھی اس لفظ کا استعمال بالکل صحیح طور پر ہوا مختلف فقہی مدرسہ ہائے فکر کے لیے۔ جیسے مذہبِ حنفی، مذہب مالکی، مذہب شافعی، مذہب حنبلی اور مذہب اہلِ حدیث جن کی حیثیت دینِ اسلام کے اصل شجرۂ ثابتہ کی فروع اور شاخوں سے زیادہ کچھ نہیں ہے!

دوسرے[2] یہ کہ اگرچہ رسولوں کی لائی ہوئی شریعتوں میں اختلاف ہوتا رہا ہے جیسے شریعتِ موسویؑ اور شریعتِ محمدیؐ کے مابین عبادات اور معاملات کے تفصیلی احکام میں نمایاں فرق ہے تاہم از حضرت آدمؑ تا آنحضورؐ جملہ انبیاء و رُسل کا دین ایک ہی تھا بفحوائے آیاتِ قرآنی:

شَرَعَ لَكُم مِّنَ الدِّينِ مَا وَصَّىٰ بِهِ نُوحًا وَالَّذِي أَوْحَيْنَا	مقرر کیا اُس (اللہ) نے تمہارے لیے (اے مسلمانو) دین کے طور پر وہی جس کی وصیت کی تھی اُس نے

---

[1] بندگی میں گھٹ کے رہ جاتی ہے اک جوئے کم آب
اور آزادی میں بحرِ بیکراں ہے زندگی!! (اقبالؔ)

[2] اس اعتبار سے غور کیا جائے تو سورۃ التوبہ کی محولہ بالا آیت کے الفاظ "وَهُمْ صَاغِرُونَ" کا مفہوم پوری طرح نکھر کر سامنے آجاتا ہے!

اِلَیْکَ وَمَا وَصَّیْنَا بِہٖٓ اِبْرٰھِیْمَ وَمُوْسٰی وَعِیْسٰی ۔	نوحؑ کو اور جو وحی کیا ہم نے (اے نبیؐ) تمہاری طرف، اور جس کی وصیّت کی تھی ہم نے ابراہیمؑ
(سورۃ الشوریٰ : آیت ۱۳)	اور موسیٰؑ اور عیسیٰؑ (علیہم السّلام) کو۔

۲- نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے 'اظہار دین الحقّ علی الدّین کلہ' اس لیے بھی ضروری تھا کہ اعلیٰ سے اعلیٰ اور عمدہ سے عمدہ نظامِ اجتماعی بھی جب تک بالفعل قائم کر کے اور عملاً چلا کے نہ دکھا دیا جائے بس ایک خیالی جنّت (UTOPIA) کی حیثیت رکھتا ہے۔ اور رسالتِ محمّدیؐ کی جانب سے نوعِ انسانی پر "شہادت" اور "اتمامِ حُجّت اور قطعِ عُذر" (جو سلسلۂ رسالت کی غرضِ اصلی ہے!) کا حق اس وقت تک ادا نہ ہو سکتا تھا جب تک کہ آپؐ اس دینِ حق کو بالفعل قائم و نافذ کر کے نہ دکھا دیتے جس کے ساتھ آپؐ مبعوث فرمائے گئے تھے۔ چنانچہ واقعہ یہ ہے کہ اگر آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلسل محنت و مشقّت اور پیہم سعی و جُہد سے 'غلبۂ دینِ حق' کی صورت میں وہ 'نظامِ عدلِ اجتماعی' بالفعل قائم نہ کر دیا ہوتا۔ جو بعد میں خلافتِ راشدہ کے دَوران بالکل اسی شان کے ساتھ پھلا پھولا جیسے ایک بند کلی کھِل کر پھُول بنتی ہے اور اس کے دَوران نوعِ انسانی کے سامنے یہ 'معجزات' عملاً رونما نہ ہو جاتے کہ "انسانی حرّیت، اخوّت اور مساوات" صرف وعظ کے موضوعات نہیں ہیں بلکہ حقیقت اور واقعہ کا رُوپ بھی دھار سکتے ہیں اور نہ صرف یہ کہ نظامِ عائلی میں مرد کی قوّامیت کے باوجود عورت کو ایک انتہائی باعزّت اور باوقار مقام دیا جا سکتا ہے بلکہ یہ بھی کہ نظامِ سیاسی میں کامل آزادیٔ رائے کے باوصف نظم اور ڈسپلن بھی برقرار رکھا جا سکتا ہے بلکہ عدل و انصاف کے جُملہ تقاضے بھی باحسن وجوہ پُورے کیے جا سکتے ہیں۔ اور اس سے بھی آگے بڑھ کر یہ کہ نظامِ معاشی کے ضمن میں انفرادی ملکیّت اور ذاتی مفاد کے جذبۂ محرّکہ کو برقرار رکھتے ہوئے بھی دولت کی تقسیم اور سرمائے کی گردش کا ایک حد درجہ معتدل اور نہایت عادلانہ و منصفانہ نظام قائم کیا جا سکتا ہے ــــــــــ

(حاشیہ اگلے صفحے پر)

تو اُس دَور کے انسان پر "دینِ حق" کی جانب سے "اتمامِ حجّت" کیسے ہو سکتا جس کے فاتح ہیں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم! اور کیسے واضح ہو سکتی یہ حقیقت کہ انسان نظامِ اجتماعی کے ضمن میں جس خیر (GOOD) یا قدر (VALUE) کا بھی تصوّر کر سکے وہ اسے بتمام وکمال اور بغایتِ توازن و اعتدال موجود پائے اس نظام میں جو آج سے چودہ سو سال قبل قائم کیا محمّدٌ رّسُولُ اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اور بالکل یہ محسوس ہو کہ نظامِ عدلِ اجتماعی کے ضمن میں نوعِ انسانی کی ساری ذہنی تگ و دَو اور عملی بھاگ دَوڑ گویا نظامِ محمدیؐ تک رسائی کی سعی و کوشش ہے، بقول علامہ اقبال ؒ :-

---

حاشیہ صفحہ گذشتہ

لے ایچ۔ جی۔ ویلز (H.G. WELLS) کو آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے جو بغض و عداوت ہے وہ اُن رکیک حملوں سے ظاہر ہے جو اُس نے آنحضورؐ کی ذاتی اور خصوصاً عائلی زندگی پر کیے ہیں۔ بایں ہمہ وہ اپنی تالیف (A CONCISE HISTORY OF THE WORLD) میں یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہو گیا کہ "انسانی حرّیت، اخوّت اور مساوات کے وعظ تو اگرچہ دنیا میں پہلے بھی بہت کہے گئے تھے۔ چنانچہ مسیح ناصری کے یہاں بھی اُن کا بڑا ذخیرہ موجود ہے لیکن نوعِ انسانی کی تاریخ میں پہلی بار ان اصولوں پر مبنی نظام عملاً قائم کر کے دکھا دیا محمّدؐ نے" (صلی اللہ علیہ وسلم)۔ یہ روشن ترین مثال ہے عربی زبان کی ایک کہاوت کی کہ "الفضل ماشَہِدَتْ بِہِ الاعدآء" (اصل کمال وہ ہے جس کا اعتراف کرنے پر دشمن بھی اپنے آپ کو مجبور پائے)

لے چنانچہ یہ "معجزہ" نہیں تو اور کیا ہے جو چودھویں صدی ہجری اور بیسویں صدی عیسوی میں ظاہر ہوا کہ جب ہندوستان کی آزادی کا وقت قریب آیا تو یہاں کا ایک ہندو مہاتما (گاندھی) مجبور ہو گیا کہ اپنے ہم قوم ہم مذہب لوگوں سے کہے کہ تمہارے سامنے نمونے کے طور پر حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کا دَورِ حکومت رہنا چاہیے (نہ کہ راماتن اور مہابھارت یا بکرماجیت یا چندر گپت موریا کا!)۔ واضح رہے کہ یہ الفاظ آنجہانی موہن داس کرم چند گاندھی نے اپنے رسالے "ہریجن" میں ۱۹۳۷ء میں اس وقت لکھے تھے جب برطانوی ہند میں پہلی بار صوبائی وزارتیں بنی تھیں اور چونکہ مسلم لیگ نے ۱۹۳۶ء کے انتخابات کا مقاطعہ کیا تھا لٰہذا پورے ہندوستان میں کانگرس ہی نے وزارتیں بنائی تھیں!

ہر کجا بینی جہانِ رنگ و بُو | آنکہ از خاکش بروید آرزُو
یا ز نورِ مصطفٰےؐ او را بہاست | یا ہنُوز اندر تلاشِ مصطفٰےؐ است

گویا آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم پر اتمامِ نعمتِ شریعت اور تکمیل دین اور ختم و اکمالِ نبوّت و رسالت کا لازمی تقاضا تھا کہ آپؐ کی بعثت کا مقصد یہ قرار پاتا کہ آپؐ انذار و تبشیر، دعوت و تبلیغ، وعظ و نصیحت، تعلیم و تربیت اور تزکیہ و اصلاح پر مستزاد تنظیم، ہجرت، جہاد اور قتال پر مشتمل ایک انقلابی جدّوجہد کے ذریعے باطل نظامِ زندگی کو بیخ و بُن سے اُکھاڑ کر اُس کی جگہ دینِ حق کو بالفعل قائم و نافذ کر دیں اور نظامِ اطاعتِ خداوندی کو پُورے نظامِ اطاعت پر عملاً غالب کر دیں۔

چنانچہ یہی ہے آپؐ کے مقصدِ بعثت کی وہ اتمامی و تکمیلی شان جس کے اعتبار سے آپؐ انبیاء و رُسل کی پوُری جماعت میں ایک منفرد مقام اور ممتاز حیثیت کے مالک ہیں۔

داعیٔ انقلاب

اس میں ہرگز کوئی شک نہیں کہ اگر دنیا کے عام داعیانِ انقلاب پر قیاس کرتے ہوئے آنحضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کو بھی داعیٔ انقلاب کے الفاظ سے یاد کیا جائے تو یہ یقیناً آپ کی تحقیر و توہین ہے، لیکن اس میں بھی ہرگز کوئی شک نہیں کہ ’داعیٔ انقلاب‘ کا اطلاق اگر نسلِ آدم کے کسی فرد پر بتمام وکمال ہوسکتا ہے تو وہ صرف مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللہِ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ ہیں! اس لیے کہ تاریخِ انسانی کے دوران اور جتنے بھی انقلاب آئے وہ بشمول انقلابِ فرانس و انقلابِ روس سب کے سب جزوی تھے اور اُن سے حیاتِ انسانی کے صرف کسی ایک گوشے ہی میں تبدیلی رُونما ہوئی جیسے انقلابِ فرانس سے نظامِ سیاسی اور ہیئتِ حکومت میں اور انقلابِ روس سے نظامِ معیشت کے تفصیلی ڈھانچے میں جب کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو انقلابِ عظیم دنیا میں برپا کیا اُس سے پوُری انسانی زندگی

میں تبدیلی رُونما ہوئی اور عقائد و نظریات، علوم و فنون، قانون و اخلاق، تہذیب و تمدّن، معاشرت و معیشت اور سیاست و حکومت الغرض حیاتِ انسانی کا کوئی گوشہ بھی بدلے بغیر نہ رہا۔

انقلابی جدّوجُہد

رہی آپؐ کی انقلابی جدّوجہد تو واقعہ یہ ہے کہ اس اعتبار سے بھی نسلِ انسانی کی پُوری تاریخ میں کوئی دوسری مثال موجود نہیں ہے کہ کسی ایک ہی شخص نے انقلابی فکر بھی پیش کیا ہو، پھر دعوت کا آغاز بھی خود ہی کیا ہو، پھر تنظیمی مراحل بھی آپ ہی طے کیے ہوں اور پھر اس انقلابی جدوجہد کو کشمکش اور تصادُم کے جُملہ مراحل اور ہجرت و جہاد و قتال کی تمام منازل سے گذار کر کامیابی سے ہمکنار بھی کر دیا ہو۔ اور یہ نہایت محیّر العقول کارنامہ اور حد درجہ عظیم معجزہ ہے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا کہ آپؐ نے ایک فردِ واحد سے دعوتِ حق کا آغاز فرما کر کل ۲۳ برس (اور وہ بھی قمری) کی مختصر سی مدّت میں اعلاءِ کلمۃِ اللہ کا حق ادا فرما دیا اور سرزمینِ عرب پر دینِ حق کو بالفعل غالب و نافذ فرما دیا۔ فصلّی اللہ علیہ وسلم وفداہ اٰباءنا واُمّھاتنا!

نبویؐ طریقِ کار

رہا یہ سوال کہ یہ عظیم تبدیلی کیسے رُونما ہوئی اور انقلابِ محمدیؐ کا منہاجِ اساسی کیا ہے؟ اور آپؐ کی انقلابی جدّوجہد کن مراحل سے گذری؟ تو یہ بجائے خود ایک مستقل موضوع ہے جس پر کسی اور صحبت میں گفتگو ہو گی!

سرِدست موضوعِ زیرِ بحث کی مناسبت سے دو مزید اُمور کی نشاندہی مطلوب ہے:

۱۔ مغربی مفکّرین کی ناسمجھی

ایک یہ کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مقصدِ بعثت کے اسی اتمامی و تکمیلی پہلو کو نہ سمجھنے کے باعث سخت ٹھوکریں کھائی ہیں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ طیّبہ کے فہم میں مغربی مفکّرین یا مُستشرقین نے۔ ان بے چاروں کے سامنے بعثتِ انبیاء و رُسل کی اساسی غرض و غایت تو ہے، چنانچہ وہ یہ تو جانتے ہیں کہ نبی و رسول داعی بھی ہوتے ہیں اور مبلّغ بھی، معلّم بھی

ہوتے ہیں اور مربّی و مزکّی بھی، بشیر بھی ہوتے ہیں اور نذیر بھی، واعظ بھی ہوتے ہیں اور ناصح بھی، ریفارمر (REFORMER) بھی ہوتے ہیں اور مُصلح بھی لیکن چونکہ اُن پر ختمِ نبوّت اور تکمیلِ رسالت کے تقاضے واضح نہیں ہیں لہٰذا یہ بات اُن کی سمجھ سے بالاتر ہے کہ کوئی نبی یا رسول صاحبِ سیف بھی ہو سکتا ہے اور صاحبِ عَلَم بھی، سپہ سالار بھی ہو سکتا ہے اور مدبّر و سیاستدان بھی۔ چنانچہ جب وہ آنحضورؐ کی شخصیّتِ مبارکہ میں یہ جُملہ کمالات پہلو بہ پہلو دیکھتے ہیں تو سخت خلجان میں مبتلا ہو جاتے ہیں چنانچہ اُن میں سے کوئی تو آپؐ کو نبی یا رسول ماننے سے ہی صریحاً انکار کر دیتا ہے اور آپؐ کی عظمت صرف بطورِ انسان تسلیم کر کے رہ جاتا ہے[1]، کوئی ایسی احمقانہ بات کہہ بیٹھتا ہے کہ "محمدؐ بحیثیّت نبی تو ناکام ہو گئے البتّہ بحیثیّتِ مُدبّر و سیاستدان کامیاب ہو گئے"[2] اور کوئی آپؐ کی شخصیّت کو دو مستقل حصّوں میں منقسم کر بیٹھتا ہے، چنانچہ اُسے "مکّے والا محمدؐ" اور نظر آتا ہے اور "مدینے والا" اور[3] فَلَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الْجَاهِلِيْنَ!

---

[1] جیسے پروفیسر منٹگمری واٹ کے الفاظ:

ONE OF THE GREATEST SONS OF ADAM

یا جیسے ڈاکٹر مائکل ہارٹ کے الفاظ:

THE ONLY MAN IN HISTORY WHO WAS SUPREMELY SUCCESSFUL ON BOTH THE RELIGIOUS AND SECULAR LEVELS

[2] جیسے پروفیسر ٹائن بی نے کہا:

MOHAMMAD FAILED AS A PROPHET BUT SUCCEEDED AS A STATESMAN

[3] جو وہم پیدا کرنا چاہا ہے پروفیسر منٹگمری واٹ نے آنحضورؐ کی سیرت پر دو مستقل کتابیں تصنیف کر کے ایک MOHAMMAD AT MECCA

اور دوسری MOHAMMAD AT MEDINA

۲۔ اُمّت کا فرضِ منصبی

اور دوسرے یہ کہ آیا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مقصدِ بعثت کی تکمیل جملہ اعتبارات سے بہ تمام وکمال ہو چکی ہے یا وہ کسی پہلو یا اعتبار سے ہنوز شرمندۂ تکمیل ہے اور اگر بات دوسری ہے اور صورتِ واقعہ یہ ہے کہ ؎

"وقتِ فرصت ہے کہاں کام ابھی باقی ہے   نورِ توحید کا اِتمام ابھی باقی ہے"!

تو کیا اُمّت صرف عید میلادُ النبیؐ منا کر، یا جلسے کر کے اور جلوس نکال کر یا ذوق وشوق کے ساتھ درود وسلام بھیج کر اپنے فرضِ منصبی سے عہدہ برآ ہو جاتی ہے ؟ ظاہر ہے کہ اِس کا جواب نفی میں ہے اور صورتِ حال واقعۃً یہ ہے کہ ؎

"وائے ناکامی متاعِ کارواں جاتا رہا   کارواں کے دِل سے احساسِ زیاں جاتا رہا"!

تاہم ؎

اِک طرزِ تغافل ہے سو وہ اُن کو مبارک   اِک عرضِ تمنّا ہے سو ہم کرتے رہیں گے!

کے مصداق گذارش ہے ـــــــ کہ اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ ختمِ نبوّت ورسالت کا ایک لازمی نتیجہ یہ ہے کہ جو کام آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے قبل انبیاء ورُسل کیا کرتے تھے آپؐ کے بعد اب وہ سب کے سب آپؐ کی اُمّت کے ذمّے ہیں۔ گویا خواہ دعوت وتبلیغ، انذار وتبشیر، تعلیم وتربیّت اور اصلاح وتزکیہ پر مشتمل فریضۂ شہادتِ حق ہو جو بعثتِ انبیاء ورُسل کی غرضِ اصلی اور غایتِ اساسی ہے خواہ اعلاءِ کلمۃِ اللہ، اقامتِ دین اور اظہارِ دینِ حق علی الدّین کُلّہٖ پر مشتمل بعثتِ محمدیؐ کا مقصدِ امتیازی اور مُنتہائے خصوصی ہو، جُملہ اہلِ ارض اور جمیع کرّۂ ارضی کے اعتبار سے یہ سارے فرائض اب ان لوگوں پر عائد ہوتے ہیں جو آنحضورؐ کے نام لیوا ہیں اور آپؐ کے نامِ نامی سے منسوب ہونے پر فخر کرتے ہیں اور آپؐ کی اُمّت میں ہونے کو موجبِ سعادت جانتے ہیں۔

اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ چونکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر نبوّت ورسالت کا سلسلہ ختم ہو گیا

لہٰذا آپؐ دو بعثتوں کے ساتھ مبعوث ہوئے، ایک اپنے زمانے کے اہلِ عرب کی جانب اور دوسری تا قیامِ قیامت پوری نوعِ انسانی کی جانب چنانچہ سورۃ الجمعہ میں بھی فرمایا گیا کہ آپؐ "اُمیّین" کے لیے بھی مبعوث ہوئے اور "آخرین" کے لیے بھی اور آغازِ کلام میں آنحضورؐ کے جس خطبے سے اقتباس دیا گیا تھا اس میں بھی آپؐ نے فرمایا:

اِنِّی لَرَسُوْلُ اللّٰہِ اِلَیْکُمْ	میں یقیناً اللہ کا فرستادہ
خَاصَّۃً وَّاِلَی النَّاسِ	ہوں تمہاری طرف خصوصاً اور پوری
کَافَّۃً	نوعِ انسانی کی جانب بالعموم!

ان میں سے "بعثتِ اولیٰ" کے جملہ فرائض "شہادت علی النّاس" اور "اظہارِ دین حق علی الدّین کُلّہٖ" دونوں کے اعتبار سے آپؐ نے بنفسِ نفیس ادا فرما دیئے خواہ اس میں مخالفت ہوئی یا مزاحمت، تمسخر ہوا یا استہزاء، ذہنی کوفت کا سامنا ہوا یا جسمانی اذیّت کا، مصیبتیں آئیں یا مشکلات، محنت کرنی پڑی یا مشقّت، پھر خواہ شعب بنی ہاشم کا دَور آیا یا یومِ طائف، اور ہجرت کا مرحلہ آیا یا جہاد کا۔ خواہ غارِ ثور میں چھپنے کی نوبت آئی یا سراقہ ابنِ مالک کے تعاقب کی، اور بدر کا معرکہ پیش آیا یا اُحد کا۔ اور خواہ مصعبؓ بن عمیر کی بے گور و کفن لاش سامنے آئی یا حمزہؓ ابن عبدالمطلب کا اعضاء بُریدہ لاشہ، خواہ خندق کا مرحلہ آیا یا حُنین کا اور خواہ خیبر کی مہم سر کرنی پڑی یا تبوک کی، آپ کے پائے ثبات میں کہیں لغزش نہ آئی اور ؎

"یا تن رسد بہ جاناں یا جاں زتن برآید!"

کے مصداق آپؐ اپنے فرضِ منصبی کی ادائیگی میں لگے رہے!

حتّٰی کہ تیئیس برس کی محنتِ شاقّہ کے نتیجے میں حق کا بول واقعۃً بالا ہو گیا، کلمۂ حق بالفعل سب سے بلند ہو گیا اور سرزمینِ عرب پر دینِ حق کا پرچم فی الواقع لہرانے لگا تا آنکہ حجّۃ الوداع کے موقع پر جمیع اطراف و اکنافِ عرب سے آتے ہوئے کم از کم تعداد کے مطابق چالیس ہزار اور بعض دوسری روایات کے مطابق سوا لاکھ افراد کے اجتماع سے

"اَلَا ھَلْ بَلَّغْتُ ؟"[1] کے جواب میں یہ گواہی لینے کے بعد کہ: نَشْھَدُ اَنَّکَ قَدْ بَلَّغْتَ وَاَدَّیْتَ وَنَصَحْتَ[2]!" آپؐ چند ہی ماہ کے اندر اندر رفیقِ اعلیٰ کی طرف رحلت فرما گئے، اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ!

آپؐ کے بعد، آپؐ کی بعثتِ عامّہ کی جملہ ذمّہ داریاں اُمّت کے کاندھوں پر آگئیں بمصداق آیتِ قرآنی: لِیَکُوْنَ الرَّسُوْلُ شَھِیْدًا عَلَیْکُمْ وَتَکُوْنُوْا شُھَدَآءَ عَلَی النَّاسِ۔ چنانچہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے جو آپؐ کے حقیقی جانشین تھے، خلافتِ راشدہ کے دوران جو واقعۃً خلافت علیٰ منہاج النبوّۃ تھی، آپؐ کی جانب سے تبلیغِ دین و 'شہادت علی النّاس'، 'اقامتِ دین' اور 'اظہارِ دینِ حق علی الدّین کلّہٖ' کے فرائض ادا کیے اور تیس سال کی قلیل سی مدّت میں اللہ کے دین کا پرچم اس وقت کی معلوم دنیا کے ایک بہت بڑے حصّے پر لہرا دیا۔

اور اس کے بعد شروع ہوا زوال و انحطاط کا وہ عمل جو مسلسل تیرہ صدیوں تک جاری رہا تا آنکہ اس صدی کے آغاز میں نوبت یہاں تک پہنچی کہ وہ دینِ حق جو پورے رُوئے ارضی پر غالب ہونے کے لیے نازل ہوا تھا "غریب الغُربا" بن کر رہ گیا۔ بقول مولانا الطاف حسین حالی مرحوم ؎

اے خاصۂ خاصانِ رُسل وقتِ دُعا ہے ۔۔۔ اُمّت پہ تری آ کے عجب وقت پڑا ہے
وہ دیں جو بڑی شان سے نکلا تھا وطن سے ۔۔۔ پردیس میں وہ آج غریب الغُربا ہے!

اور

پستی کا کوئی حد سے گذرنا دیکھے ۔۔۔ اسلام کا گر کر نہ اُبھرنا دیکھے!

---

[1] "میں نے (آپ لوگوں تک پیغامِ الٰہی) پہنچا دیا یا نہیں؟"

[2] "ہم گواہ ہیں کہ آپ نے تبلیغ بھی فرما دی امانت بھی ادا فرما دی اور (ہماری) خیر خواہی کا حق بھی ادا فرما دیا۔"

مانے نہ کبھی کہ مدّ ہے ہر جزر کے بعد   دریا کا ہمارے جو اُتر نا دیکھے!

الغرض آج کی گفتگو کا حاصل یہ ہے کہ ضرورت ہے کہ اب پھر اُمّتِ محمّد علی صاحبہا الصّلوٰۃ والسّلام اپنے فرضِ منصبی کو پہچانے اور اس سے عہدہ برآ ہونے کے لیے ایک عزمِ نو کے ساتھ کمربستہ ہو جائے، تا کہ بعثتِ محمّدی کا مقصد بتمام و کمال پُورا ہو اور پورے کُرّۂ ارضی پر دینِ محمّدؐ کا پرچم لہرا اُٹھے ؎

کی محمّدؐ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں   یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں

اَللّٰهُمَّ انْصُرْ مَنْ نَصَرَ دِيْنَ مُحَمَّدٍ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَاجْعَلْنَا مِنْهُمْ وَاخْذُلْ مَنْ خَذَلَ دِيْنَ مُحَمَّدٍ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَلَا تَجْعَلْنَا مَعَهُمْ.

آمِیْن یَارَبَّ الْعٰلَمِیْنَ!

انقلابِ نبویؐ کا اساسی منہاج

اس میں ہرگز کوئی شک نہیں کہ اگر دنیا کے عام داعیانِ انقلاب پر قیاس کرتے ہوئے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ''داعیٔ انقلاب'' کے الفاظ سے یاد کیا جائے تو یہ یقیناً آپؐ کی تحقیر و توہین ہو گی۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس میں بھی ہرگز کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں کہ ''داعیٔ انقلاب'' کا اطلاق اگر نسلِ آدم کے کسی فرد پر بہ تمام و کمال ہو سکتا ہے تو وہ صرف محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ اس لیے کہ تاریخِ انسانی کے دوران اور جتنے بھی انقلاب آئے وہ بشمول انقلابِ فرانس و انقلابِ روس سب کے سب جزوی تھے اور اُن کے نتیجے میں حیاتِ انسانی کے صرف کسی ایک ہی گوشے میں تبدیلی رونما ہوئی۔ جیسے انقلابِ فرانس سے نظامِ سیاست و حکومت میں اور انقلابِ روس سے نظامِ معیشت کے تفصیلی ڈھانچے میں جبکہ نبی اکرمؐ نے جو انقلابِ عظیم دنیا میں برپا کیا اس سے پوری انسانی زندگی میں تبدیلی رونما ہوئی اور عقائد و نظریات، علوم و فنون، قانون و اخلاق، تہذیب و تمدن، معاشرت و معیشت اور سیاست و حکومت الغرض حیاتِ انسانی کا کوئی ایک گوشہ بھی بدلے بغیر نہ رہا۔

مزید برآں اس اعتبار سے بھی نسلِ انسانی کی پوری تاریخ میں کوئی دوسری مثال موجود نہیں ہے کہ کسی ایک ہی شخص نے انقلابی فکر بھی پیش کیا ہو، پھر دعوت کا آغاز بھی خود ہی کیا

ہو، پھر تنظیمی مراحل بھی خود ہی طے کیے ہوں اور پھر اس انقلابی جدّوجہد کو کشمکش اور تصادم کے جُملہ مراحل سے گذار کر خود ہی کامیابی سے ہمکنار بھی کر دیا ہو۔ کون نہیں جانتا کہ انقلابِ فرانس اُس فکر کے نتیجے میں رُونما ہوا جو والٹیئر اور رُوسو ایسے بیسیوں مصنّفوں کی تالیفات کے ذریعے تخلیق پایا اور پھیلا۔ لیکن انقلاب عملاً کچھ اوباش لوگوں کے ہاتھوں برپا ہوا اور اس کی بالفعل رہنمائی میں ان مفکّرین کا کوئی حِصّہ نہیں۔ اِسی طرح انقلابِ روس کی اساس اس فکر پر قائم ہوئی جو مارکس نے اپنی شہرۂ آفاق تصنیف "داس کیپیٹل" کے ذریعے پیش کیا لیکن خود مارکس کی زندگی میں کسی ایک گاؤں میں بھی انقلاب کے عملاً برپا ہونے کا امکان پیدا نہ ہو سکا۔ اگرچہ بعد میں ایک فعّال شخص لینن نے اس فکر کے ذریعے انقلاب برپا کر دیا ——— اس پس منظر میں دیکھا جائے تو واقعہ یہ ہے کہ یہ ایک نہایت محیّر العقول کارنامہ اور حد درجہ عظیم معجزہ ہے نبی اکرمؐ کا کہ آپ نے ایک فردِ واحد سے دعوت کا آغاز فرما کر کل ۲۳ برس میں اور وہ بھی شمسی نہیں قمری، انقلابِ اسلامی کی تکمیل فرما دی اور ایک وسیع و عریض خطّے پر دینِ حق کو اپنے سماجی، معاشی اور سیاسی ڈھانچے سمیت بالفعل قائم و نافذ کر دیا۔ فصلّی اللّٰہ علیہ وعلیٰ اٰلہٖ و اصحابہٖ وسلّم تسلیماً کثیراً کثیرا وفداہُ اباءُنا واُمّھاتنا!

ایک فردِ واحد کی مختصر سی زندگی کے بائیس سالوں میں تاریخ انسانی کے عظیم ترین اور ہمہ گیر ترین انقلاب کے از ابتداء تا انتہاء جملہ مراحل طے پا جانے کا نتیجہ یہ نکلا کہ آنحضورؐ کی حیاتِ طیّبہ کے دوران حالات و واقعات کی رفتار (TEMPO) اتنی تیز اور انقلابی عمل کا زور اتنا شدید نظر آتا ہے کہ سیرتِ مُطہّرہ کے مطالعے میں بالعموم نگاہیں صرف تصادم و کشمکش کے مختلف مراحل و مظاہر میں اُلجھ کر رہ جاتی ہیں اور جس طرح کسی زور شور سے بہنے والی پہاڑی ندّی کو دیکھتے ہوئے انسان بالعموم اس کی سطح کے ہیجان و اضطراب ہی سے مبہوت سا ہو کر رہ جاتا ہے اور اُس کی گہرائی کے بارے میں سوچنے کا موقع ہی اسے نہیں ملتا۔ اسی طرح انقلابِ نبویؐ کا اساسی منہاج بھی نگاہوں سے اوجھل رہ گیا ہے۔ چنانچہ اوّل اوّل تو سیرتِ مُطہّرہ سے

متعلّق جو مواد جمع ہوا تھا، وہ تھا ہی سارے کا سارا مغازی پر مشتمل۔ تاحال بھی سیرتِ مبارکہ کے مطالعے میں اصل توجّہ مرتکز رہتی ہے ہجرت سے پہلے کی PASSIVE RESISTANCE پر جس کے اہم نقوش ہیں تمام مسلمانوں پر بالعموم اور غلاموں پر بالخصوص شدید بہیمانہ تشدّد (PERSECUTION) ہجرتِ حبشہ، شعبِ بنی ہاشم، یومِ طائف، فیصلۂ قتلِ نبوی، محاصرۂ کاشانۂ نبوّت، غارِ ثور اور تعاقبِ سراقہ ابن مالک ——— اور ہجرت کے بعد کے اقدام اور ACTIVE RESISTANCE پر جس کے اہم اور نمایاں نشانات ہیں قریش کی معاشی ناکہ بندی، بدر، اُحد اور احزاب کا مسلّح تصادم جس میں عارضی سا وقفہ ہوا صلح حدیبیہ سے جس کے ختم ہوتے ہی تصادم دوگونہ ہوگیا۔ یعنی اندرونِ عرب بھی جس کے اہم نقوش ہیں فتحِ خیبر، فتحِ مکّہ اور غزوۂ حنین اور بیرونِ عرب بھی جس کے نمایاں نشانات ہیں غزوۂ موتہ اور سفرِ تبوک۔

حضرتِ اکبر الٰہ آبادی کے اس حد درجہ سلیس لیکن نہایت پُرمعنی شعر کے مصداق کہ ؎

خدا کے کام دیکھو بعد کیا ہے اور کیا پہلے نظر آتا ہے مجھ کو بدر سے غارِ حرا پہلے!

غور کرنا چاہیے کہ آنحضورؐ کی عظیم انقلابی جدّوجہد کی تہہ میں کارفرما وہ اصل طریقِ کار اور اساسی منہجِ عمل کیا تھا جس کے ذریعے وہ مردانِ کار فراہم ہوئے جنہوں نے آیۂ قرآنی:

مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا	"اہلِ ایمان میں جواں مرد ہیں جنہوں نے
مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ فَمِنْهُمْ	پورا کر دکھایا وہ عہد جو انہوں نے اللہ سے کیا
مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَمِنْهُمْ	تھا پس ان میں سے وہ بھی ہیں جو اپنی نذر
مَّنْ يَّنْتَظِرُ وَمَا بَدَّلُوْا تَبْدِيْلًا ۝	پیش کر کے سرخرو ہو چکے اور وہ بھی ہیں جو
(سورۃ الاحزاب: ۲۳)	منتظر ہیں کہ کب باری آتے اور وہ بھی اللہ

کی راہ میں سر کٹا کر سبکدوش ہو جائیں۔ بہرصورت انہوں نے اپنے مَوقف سے سرِ مُو تبدیلی نہیں کی۔"

کے مصداق انقلابِ نبویؐ کے شجرۂ طیّبہ کو اپنے خون سے سینچا اور اپنی ہڈیوں اور گوشت پوست

کی کھاد سے پروان چڑھایا ہے

بنا کردند خوش رسمے بخاک و خون غلطیدن　　　خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را

قرآن حکیم کی چار اہم اصطلاحات

اس سوال کے جواب کے لیے جب ہم قرآن حکیم کی جانب رجوع کرتے ہیں تو حیرت ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آنحضورؐ کے مقصدِ بعثت کے انقلابی پہلو کی وضاحت کے لیے اگر تین بار ان الفاظِ مبارکہ کو دہرایا کہ:

هُوَ الَّذِیٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی	یعنی وہی ہے (اللہ) جس نے بھیجا اپنے
وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّیْنِ	رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کو 'الہدیٰ' اور
كُلِّهٖ　(سورۃ التوبۃ: ۳۳)	'دینِ حق' کے ساتھ تاکہ غالب کر دے اُس کو
سورۃ الفتح: ۲۸۔ اور سورۃ الصّف: ۹)	پورے کے پورے دین پر!

تو انقلابِ نبویؐ کے اساسی منہاج کی وضاحت کے لیے بھی چار اہم اور بنیادی اصطلاحات کو پورے چار بار دُہرایا ——— یعنی:

۱۔ تلاوتِ آیات، ۲۔ تزکیۂ نفوس، ۳۔ تعلیمِ کتاب اور ۴۔ تعلیمِ حکمت!

۱۔　چنانچہ سب سے پہلے سورۃ البقرۃ کے پندرھویں رکوع کے آخر میں حضرتِ ابراہیمؑ اور حضرتِ اسمٰعیلؑ کی دعا میں یہ الفاظ وارد ہوئے:

رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَیْنِ لَكَ وَمِنْ	اے ربّ ہمارے ہم دونوں کو بھی اپنا
ذُرِّیَّتِنَآ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ ۪ وَ	فرمانبردار بنائے رکھ اور ہماری نسل میں سے
اَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبْ عَلَیْنَا ۚ اِنَّكَ	بھی ایک ایسی اُمّت برپا کیجو جو تیری فرمانبردار
اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ ○ رَبَّنَا	ہو۔ اور ہمیں تعلیم فرما ہماری عبادت کے

وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ
يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ
الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ ۭ
إِنَّكَ أَنْتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ۝
(سورۃ البقرہ: ۱۲۸-۱۲۹)

طور طریقے۔ اور قبول فرما ہماری توبہ یقیناً تو توبہ قبول کرنے اور رحم فرمانے والا ہے۔ اور اے ربّ ہمارے تو مبعوث فرمائیو ان میں ان ہی میں سے ایک رسول جو اُن کو سنائے تیری آیتیں، اور انہیں تعلیم دے کتاب اور حکمت کی اور تزکیہ کرے اُن کا۔ بے شک تو ہی ہے سب پر غالب اور کامل حکمت والا۔

۲۔ پھر تین ہی رکوعوں کے بعد، اٹھارویں رکوع کے آخر میں یہ واضح کرتے ہوئے کہ آنحضورؐ کی بعثت دراصل اسی دعائے ابراہیمؑ و اسمٰعیلؑ علیٰ نبیّنا وعلیہما الصلوٰۃ والسلام کا ظہور ہے، ان ہی اصطلاحاتِ اربعہ کو دہرایا گیا:

كَمَآ أَرْسَلْنَا فِيكُمْ رَسُولًا مِّنْكُمْ
يَتْلُوا عَلَيْكُمْ آيٰتِنَا وَيُزَكِّيكُمْ
وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ
وَيُعَلِّمُكُمْ مَّا لَمْ تَكُونُوا تَعْلَمُونَ ۝
(سورۃ البقرۃ: ۱۵۱)

چنانچہ بھیج دیا ہے ہم نے تم میں ایک رسول تم ہی میں سے جو سناتا ہے تمہیں ہماری آیات اور تزکیہ کرتا ہے تمہارا اور تعلیم دیتا ہے تمہیں کتاب اور حکمت کی اور تعلیم دیتا ہے تمہیں ان چیزوں کی جنہیں تم نہیں جانتے تھے۔

۳۔ اگلی سورت یعنی سورۂ آل عمران میں یہ مضمون مزید شان اور آن بان کے ساتھ وارد ہوتا ہے:

لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ
إِذْ بَعَثَ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْ أَنْفُسِهِمْ
يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيٰتِهٖ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ
الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَإِنْ كَانُوا مِنْ قَبْلُ
لَفِي ضَلٰلٍ مُّبِينٍ ۝ (سورۃ آل عمران: ۱۶۴)

اللہ نے احسانِ عظیم فرمایا ہے اہلِ ایمان پر کہ اٹھایا ان میں ایک رسول ان ہی میں کا جو سناتا ہے انہیں اُس کی آیات اور تزکیہ کرتا ہے ان کا اور تعلیم دیتا ہے انہیں کتاب اور حکمت کی۔ اور یقیناً وہ تھے اس سے قبل کھلی گمراہی میں!

۴۔ آخری بار یہ مضمون اٹھائیسویں پارے میں سورۃ الجمعہ میں آتا ہے :

هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْأُمِّيّٖنَ	وہی ہے (اللہ) جس نے اُٹھایا اُمیوں
رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ	میں ایک رسول ان ہی میں سے جو سناتا
اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ	ہے انہیں اس کی آیات اور تزکیہ کرتا
الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَاِنْ كَانُوْا	ہے ان کا اور تعلیم دیتا ہے ان کو کتاب
مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝	اور حکمت کی۔ یقیناً وہ تھے اس سے
(سورۃ الجمعۃ : ۲)	قبل کھُلی گمراہی میں۔!

اور یہاں اس کی اہمیّت اِس اعتبار سے بہت بڑھ جاتی ہے کہ سورۃ الجمعۃ سے متّصلاً قبل ہے سورۃ الصّف جس کی مرکزی آیت وہی ہے جس میں آنحضورؐ کے مقصدِ بعثت کے انقلابی پہلو کو واضح کیا گیا ہے، یعنی :۔

هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ

گویا آنحضورؐ کا مقصدِ بعثت ہے : 'اظہارِ دینِ حق علی الدین کُلّہٖ' اور اُس کے لیے آپ کا طریقِ کار اور منہجِ عمل ہے : تلاوتِ آیات، تزکیہ اور تعلیمِ کتاب و حکمت!

مقصد اور طریقِ کار

اس مقام پر ذرا توقّف کر کے ایک اہم حقیقت پر غور کر لینا چاہیے اور وہ یہ کہ کسی بھی اہم کام کے لیے مقصد اور طریقِ کار دونوں نہایت اساسی اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔ مقصد میں آخری منزل پیشِ نظر رہتی ہے اور طریقِ کار میں ہر ہر مرحلے کے لوازم پر توجّہ دی جاتی ہے اور ظاہر ہے کہ اِن دونوں کا توازن ہی کسی کام کے پایۂ تکمیل تک پہنچنے کا ضامن بن سکتا ہے اور جو شخص یا گروہ بیک وقت ان دونوں کو ملحوظ نہ رکھ سکے وہ اپنی منزل کھوٹی کر بیٹھتا ہے۔ ماضی کی تاریخ بھی ایسی مثالوں سے بھری ہوئی ہے اور خود ہمارے گردوپیش بھی اس کی زندہ مثالیں موجود ہیں کہ

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ کوئی شخصیت یا جماعت اپنے پیشِ نظر مقصود کے حصول کی عجلت میں درمیانی مراحل کو پھلانگ جانا چاہتی ہے اور کسی راہِ قصیر (SHORT CUT) کی دلدل میں ایسی پھنستی ہے کہ پھر لاکھ ہاتھ پاؤں مارنے کے باوجود اس سے چھٹکارا نصیب نہیں ہوتا اور وہ راہِ قصیر اتنی طویل ہو جاتی ہے کہ ختم ہونے ہی میں نہیں آتی۔ گویا وہ کمبل کو چھوڑنا چاہے بھی تو کمبل اُسے نہیں چھوڑتا۔ یہ دوسری بات ہے کہ وقفہ وقفہ سے اپنے متوسّلین کی ہمّت یہ کہہ کر بندھائی جاتی رہے کہ : ع

"اس موڑ سے آگے منزل ہے مایوس نہ ہو دراتا جا!"

اور کبھی اس کے برعکس یہ ہوتا ہے کہ کوئی شخص یا گروہ ذریعے ہی کو مقصد بنا بیٹھتا ہے اور راستے ہی کو منزل قرار دے لیتا ہے۔ نتیجۃً ساری توانائیاں ایک دائرے میں حرکت کرتے رہنے میں صرف ہو جاتی ہیں اور اہلِ قافلہ وَهُمْ يَحْسَبُونَ اَنَّهُمْ يُحْسِنُونَ صُنْعًا کے مصداق صرف حرکت اور اس کی تیز رفتاری ہی کو دیکھ دیکھ کر خوش ہوتے رہتے ہیں۔

اب اگر اس حقیقت سے فرار ممکن نہیں کہ ہر کام کے لیے ایک مناسب طریق ہوتا ہے اور ہر مقصد کے لیے ہر طریق کارموزوں نہیں ہوتا تو جو لوگ خِلافۃ علیٰ منہاج النّبوّۃ کے قیام کے خواہش مند ہوں اُن کے لیے لازمی و لابُدی ہے کہ وہ غور کریں کہ آنحضورؐ کا اصل منہجِ عمل کیا تھا۔ مبادا وہ بھی متذکرہ بالا افراط و تفریط کا شکار ہو کر رہ جائیں!

اِس ضمن میں کتنی پیاری ہے وہ بات جو امام مالکؒ نے فرمائی کہ لَا يَصْلُحُ اٰخِرُ هٰذِهِ الْاُمَّةِ اِلَّا بِمَا صَلَحَ بِهٖ اَوَّلُهَا۔ "اس اُمّت کے آخری حصّے کی اصلاح نہ ہو سکے گی مگر صرف اُسی طریق پر جس پر پہلے حصّے کی کایا پلٹ ہوئی تھی" ——— اور کتنی حیرتناک ہے یہ حقیقت کہ دَورِ نبویؐ سے اس قدر قرب کے باوصف ائمّہ دین کو کتنی فکر تھی اس آخری دَور کی جس میں ہم جی رہے ہیں!

اس ضمن میں ایک اور اہم حقیقت بھی قابلِ توجّہ ہے اور وہ یہ کہ اگر کسی کا یہ خیال

ہے کہ قرآنِ حکیم انقلابِ اسلامی کے لیے کسی منہجِ عمل کی جانب رہنمائی نہیں کرتا تو اسے محسوس کرنا چاہیے کہ یہ قرآن مجید پر بھی ایک سنگین طعن ہے اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ بھی حد درجہ ناروا سوءِ ظن۔ اس لیے کہ مسلمانوں پر 'خلافت علیٰ منہاج النبوّۃ' کے قیام کی سعی کو مستقلاً فرض اور واجب کر دینا لیکن اس کے لیے کسی واضح طریقِ کار کی نشاندہی نہ کرنا صریح ظلم قرار پائے گا۔ سُبۡحَانَہٗ وَتَعَالٰی عَمَّا یَصِفُوۡنَ! اصل بات یہ ہے کہ ہم نے نہ تو بلفحوائے آیتِ قرآنی: "وَمَا قَدَرُوا اللّٰہَ حَقَّ قَدۡرِہٖ" اللہ تعالیٰ ہی کی عظمت کو پہچانا، نہ بلفحوائے آیتِ مبارکہ: "اَفَلَا یَتَدَبَّرُوۡنَ الۡقُرۡاٰنَ اَمۡ عَلٰی قُلُوۡبٍ اَقۡفَالُہَا" قرآن حکیم ہی پر غور کیا۔ بلکہ اسے: "نَبَذَ فَرِیۡقٌ مِّنَ الَّذِیۡنَ اُوۡتُوا الۡکِتٰبَ کِتٰبَ اللّٰہِ وَرَآءَ ظُہُوۡرِہِمۡ" کے مصداق پسِ پشت ڈال دیا اور صرف حصُولِ وایصالِ ثواب کا آلہ بنا کر رکھ دیا۔

توہی ناداں چند کلیوں پر قناعت کر گیا ورنہ گلشن میں علاجِ تنگیٔ داماں بھی تھا

مرکز و محورِ قرآنِ حکیم

اب ذرا ان چار اصطلاحات پر توجّہ مرکوز فرمائیے جن میں نبی اکرمؐ کے اساسی منہجِ عمل کا بیان ہوا ہے تو سب سے نمایاں حقیقت جو سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ ان سب کا مرکز و محور خود قرآنِ حکیم ہے! اس لیے کہ ان میں سے پہلی اور تیسری یعنی تلاوتِ آیات اور تعلیمِ کتاب تو بالبداہت قرآن مجید ہی سے متعلّق ہیں۔ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ دوسری اور چوتھی کا مدار بھی قرآن ہی پر ہے اس لیے کہ بلفحوائے الفاظِ قرآنی: "قَدۡ جَآءَتۡکُمۡ مَّوۡعِظَۃٌ مِّنۡ رَّبِّکُمۡ وَشِفَآءٌ لِّمَا فِی الصُّدُوۡرِ"[1] (لوگو! آگئی ہے تمہارے پاس تمہارے رَبّ کی جانب سے موعظت و نصیحت بھی اور جملہ امراضِ قلبی کی شفا بھی)، تزکیۂ نفوس، تصفیۂ قلوب اور تجلیۂ باطن درحقیقت ثمرہ ہے تلاوتِ آیات کا اور بلفحوائے آیتِ قرآنی: "ذٰلِکَ مِمَّاۤ اَوۡحٰۤی اِلَیۡکَ رَبُّکَ مِنَ الۡحِکۡمَۃِ"[2] (یہ ہے

---

[1] سورۃ یونس: ۵۷ [2] سورۃ بنی اسرائیل: ۳۹

وہ حکمت جو تیرے ربّ نے تجھ پر وحی فرمائی، حکمت بھی جزوِ لاینفک ہے قرآنِ حکیم کا!
گویا انقلابِ نبویؐ کا اساسی منہجِ عمل پُورے کا پُورا گھومتا ہے
قرآنِ مجید کے گرد، یا سادہ الفاظ میں یُوں کہہ لیا جائے کہ آنحضورؐ
کا آلۂ انقلاب ہے قرآنِ حکیم!

یہ ہے وہ حقیقت جسے نہایت سادہ اور سلیس الفاظ میں تو بیان کیا مولانا حالی نے کہ:

اُتر کر حِرا سے سوئے قوم آیا — اور اک نسخۂ کیمیا ساتھ لایا!

اور حد درجہ پُرشکوہ الفاظ میں بیان فرمایا علاّمہ اقبال نے کہ: ؎

گر تو می خواہی مسلماں زیستن — نیست ممکن جز بقرآں زیستن
آں کتابِ زندہ قرآنِ حکیم — حکمتِ اُو لایزال است و قدیم
فاش گویم آنچہ در دل مضمر است — ایں کتابے نیست چیزے دیگر است
مثلِ حق پنہاں وہم پیدا ست اُو — زندہ و پائندہ و گویا ست اُو
چُوں بجاں در رفت جاں دیگر شود — جاں چوں دیگر شد جہاں دیگر شود

گویا آنحضورؐ کی تعلیم و تربیت کا ثمرہ یہ تھا کہ قرآنِ حکیم: "چوں بجاں در رفت!" کے مصداق صحابہ کرامؓ کے باطن میں سرایت کر گیا اور اُن کے اذہان و قلوب اس کے نُور سے منوّر ہو گئے۔ نتیجۃً اُن کی زندگیوں میں ایک انقلابِ عظیم برپا ہو گیا۔ اُن کی سوچ بدل گئی، اُن کا فکر بدل گیا، اُن کے عقائد بدل گئے، اُن کی اقدار بدل گئیں، اُن کے عزائم بدل گئے، اُن کے مقاصد بدل گئے، اُن کی آرزوئیں بدل گئیں، اُن کی تمنّائیں بدل گئیں، اُن کے دن بدل گئے، اُن کی راتیں بدل گئیں، اُن کی صبحیں بدل گئیں، اُن کی شامیں بدل گئیں، اُن کی زمین بدل گئی، اُن کا آسمان بدل گیا، یہاں تک کہ اگر پہلے زندگی عزیز تھی تو اب موت عزیز تر ہو گئی! اور یہ ساری تبدیلی ثمرہ تھی ایک کتاب اور اُس کے علم و حکمت کا اور اس کے معلّم اور اس کی تعلیم و تربیّت کا — فصلی اللہ علیہ وسلم! اسی لیے فرمایا آنحضورؐ

نے کہ: "اِنَّمَا بُعِثۡتُ مُعَلِّمًا" (میں تو صرف معلم بنا کر بھیجا گیا ہوں[1])، واضح رہنا چاہیے کہ آنحضورؐ کا اصل ایجابی اور مثبت عمل صرف اور صرف تلاوتِ آیات و تزکیہ اور تعلیم کتاب و حکمت تھا۔ تصادم اور کشمکش کی وہ ساری صورتیں جن کا ذکر پہلے ہو چکا ہے اصلاً مظہر ہیں اس ردِّ عمل کا جو ایک غلط نظامِ فکر و عمل کی جانب سے دعوتِ حق کے جواب میں پیش آنا لازمی ہے۔ تاہم اصل عمل اور ردِّ عمل کے تدارک کے لیے اختیار کی جانے والی تدابیر کے مابین فرق و امتیاز نہ کرنا بڑی ناسمجھی ہے!

کتابِ الٰہی اور اس کے معلّم کی ذاتِ اقدس کی عظمت تو ظاہر ہے کہ بیان تو کجا تخیّل و ادراک کی گرفت میں بھی نہیں آسکتی۔ موجودہ دَور میں تو ایک عام انسان کی تصنیف[2] کا یہ اعجاز نگاہوں کے سامنے ہے کہ روئے زمین کے ایک بہت بڑے حصّے پر جو نظام قائم ہے وہ سب اس کے ظہور و بروز کے سوا اور کچھ نہیں۔ غالباً اسی لیے کہا تھا علامہ اقبال مرحوم نے مارکس کے بارے میں کہ ع: "نیست پیغمبر ولیکن در بغل دارد کتاب"!

تلاوتِ آیات

اِس اجمال کی تفصیل قرآنِ حکیم کے طول و عرض میں تانے بانے کے مانند بُنی ہوئی ہے۔ چنانچہ کارِ نبوّت و رسالت کی تکمیل اور فرائضِ دعوت و تبلیغ کے جتنے پہلو قرآن مجید میں بیان ہوئے ہیں اُن سب کا مبنیٰ و مدار اور مرکز و محور خود قرآن ہی کو قرار دیا گیا ہے۔ اِس ضمن میں طوالت کے خوف کے باوجود چند اشارات ضروری ہیں:-

۱۔ قرآن حکیم کی رُو سے انبیاء و رُسل کے فرائض میں سب سے زیادہ اساسی فریضہ اِنذار و تبشیر کا ہے۔ چنانچہ سورۃ النساء میں بہت سے انبیاء و رُسل کا ذکر کر کے فرمایا گیا:

رُسُلًا مُّبَشِّرِیۡنَ وَمُنۡذِرِیۡنَ (یہ حضرات) رسول بنا کر بھیجے گئے بشارت دینے

---

[1] سُنن ابنِ ماجہؒ [2] داس کیپٹیل

لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ	والے اور خبردار کرنے والے ، تاکہ ان (کی
حُجَّةٌ م بَعْدَ الرُّسُلِ ط	بعثت) کے بعد لوگوں کے پاس خدا کے
(سورۃ النساء : ۱۶۵)	سامنے کوئی دلیل (عذر) نہ رہ سکے !

سورۃ الکہف میں بطورِ کُلیہ ارشاد فرمایا :

وَمَا نُرْسِلُ الْمُرْسَلِيْنَ اِلَّا	اور ہم نہیں بھیجتے رسولوں کو مگر صرف مُبشّر
مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ ج (آیت : ۵۶)	اور نذیر بنا کر !

اور سورۃ بنی اسرائیل میں تعیّن کے ساتھ آنحضورؐ کو خطاب کر کے فرمایا :

وَمَا اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا مُبَشِّرًا وَّ	اور نہیں بھیجا (اے نبیؐ) ہم نے آپ
نَذِيْرًا ٥ (آیت : ۱۰۵)	کو مگر صرف مُبشّر اور نذیر بنا کر !

اب دیکھئے کہ از روئے قرآن اس انذار و تبشیر کا مبنیٰ و مدار خود قرآنِ حکیم ہی ہے :-

سورۃ بنی اسرائیل میں فرمایا :

اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَهْدِيْ لِلَّتِيْ	بے شک یہ قرآن اُس راستے کی راہنمائی
هِيَ اَقْوَمُ وَيُبَشِّرُ الْمُؤْمِنِيْنَ	کرتا ہے جو بالکل سیدھا ہے اور ان ایمان
الَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ الصّٰلِحٰتِ اَنَّ	والوں کو جو نیک عمل کرتے ہیں ، اس
لَهُمْ اَجْرًا كَبِيْرًا ٥ وَّاَنَّ الَّذِيْنَ	بات کی بشارت دیتا ہے کہ اُن کے لیے
لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ اَعْتَدْنَا لَهُمْ	بہت بڑا اجر ہے اور جو لوگ آخرت پر ایمان
عَذَابًا اَلِيْمًا ٥	نہیں رکھتے ہم نے اُن کے لیے ایک دردناک
(سورۃ بنی اسرائیل : ۹ - ۱۰)	عذاب تیار کر رکھا ہے !

سورۃ الکہف کا آغاز ان مبارک الفاظ سے ہوا :

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ عَلٰى عَبْدِهِ	شکر کا سزاوار ہے وہ اللہ جس نے اپنے
الْكِتٰبَ وَلَمْ يَجْعَلْ لَّهٗ عِوَجًا ٥	بندے پر کتاب اُتاری - اور اس میں

قَيِّمًا لِّيُنْذِرَ بَاْسًا شَدِيْدًا مِّنْ لَّدُنْهُ وَيُبَشِّرَ الْمُؤْمِنِيْنَ الَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ اَجْرًا حَسَنًا ۝ (سورۃ الکہف : ۱-۲)	اس نے کوئی کج پیچ نہیں رکھا۔ بالکل ہموار اور استوار، تاکہ وہ اپنی جانب سے جھٹلانے والوں کو ایک سخت عذاب سے آگاہ کر دے اور ایمان لانے والوں کو جو نیک اعمال کر رہے ہیں، اس بات کی خوشخبری سنا دے کہ اُن کے لیے بہت اچھا اجر ہے!

اور سورۂ مریم کے اختتام پر فرمایا:

فَاِنَّمَا يَسَّرْنٰهُ بِلِسَانِكَ لِتُبَشِّرَ بِهِ الْمُتَّقِيْنَ وَتُنْذِرَ بِهٖ قَوْمًا لُّدًّا ۝ (سورۃ مریم : ۹۷)	پس ہم نے اِس کتاب کو تمہاری زبان میں اس لیے سہل و سازگار بنایا کہ تم اس کے ذریعے خدا ترسوں کو بشارت پہنچا دو اور جھگڑالو قوم کو آگاہی سنا دو۔

سورۃ الانعام میں فرمایا:

وَاُوْحِيَ اِلَيَّ هٰذَا الْقُرْاٰنُ لِاُنْذِرَكُمْ بِهٖ وَمَنْۢ بَلَغَ ۚ (سورۃ الانعام : ۱۹)	اور میری طرف یہ قرآن وحی کیا گیا ہے کہ میں اس کے ذریعے سے تمہیں بھی خبردار کر دوں اور اُن کو بھی جن تک یہ پہنچ جائے

۲۔ فرائض نبوت کے ضمن میں قرآنِ حکیم کی دوسری اہم اصطلاح 'تذکیر' ہے۔ اِس ضمن میں اس سے قطع نظر کہ قرآن خود اپنے آپ کو جابجا الذّکر، ذِکرٰی اور تَذْکِرَۃ قرار دیتا ہے۔ سورۂ قٓ کے آخر میں یہ صریح حکم بھی دے دیا گیا کہ:

فَذَكِّرْ بِالْقُرْاٰنِ مَنْ يَّخَافُ وَعِيْدِ ۝ یعنی تذکیر کرو بذریعہ قرآنِ حکیم۔ ----

۳۔ اِسی طرح فرائضِ رسالت کے ذیل میں قرآنِ حکیم کی ایک اہم اصطلاح 'تبلیغ' ہے چنانچہ اس کے ضمن میں بھی اللہ تعالیٰ نے تو اپنے نبیؐ سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ: "بَلِّغْ مَآ

أُنزِلَ اِلَيکَ مِن رَّبِّکَ[1] (پہنچادو جو کچھ نازل کیا گیا تم پر تمہارے رب کی جانب سے) اور آنحضورؐ نے اُمّت کو حکم دیا کہ: "بَلِّغُوا عَنِّي وَلَو آيَةً"[2] (پہنچادو میری جانب سے خواہ قرآن کی ایک ہی آیت ہو!)، گویا تبلیغ کا اصل موضوع قرآن مجید اور اُس کی آیاتِ بیّنات کے سوا اور کچھ نہیں!!

۴۔ غالباً اس سلسلے کی سب سے جامع اصطلاح 'دعوت' ہے جس کے ضمن میں سورۃ النحل میں یہ جامع و مانع ہدایت دی گئی کہ:

اُدعُ اِلٰی سَبِيلِ رَبِّکَ بِالحِکمَةِ	بلاؤ اپنے ربّ کے راستے کی طرف
وَالمَوعِظَةِ الحَسَنَةِ وَجَادِلهُم	حکمت کے ساتھ اور موعظۂ حسنہ سے
بِالَّتِي هِيَ اَحسَنُ ط	اور بحث و جدال کرو اِس طور سے
(سورۃ النحل: ۱۲۵)	جو نہایت عمدہ ہو۔

اب غور فرمائیے کہ جیسے پہلے بیان کیا جاچکا ہے حکمت بھی قرآنِ حکیم ہی کا ایک جُزوِ لاینفک ہے اور موعظۂ حسنہ کا مصداقِ کامل بھی خود قرآنِ مجید ہی ہے اور خواہ ملحدین ہوں یا مشرکین، یہود ہوں یا نصاریٰ، منکرینِ قیامت ہوں یا مکذّبینِ رسالت، کافر ہوں یا منافق اِن سب کے ساتھ مفصّل مباحثہ و مجادلہ بھی قرآن میں موجود ہے۔ گویا دعوت اِلی اللہ یا دعوت اِلیٰ سبیلِ ربّ کا اصل مبنیٰ و مدار خود قرآنِ حکیم ہے۔

الغرض یہ تفصیل و تشریح ہوئی 'تلاوتِ آیات' کی کہ انذار ہو یا تبشیر، تبلیغ ہو یا تذکیر اور مُباحثہ ہو یا مجادلہ، دعوتِ نبویؐ کا مرکز و محور ہیں آیاتِ قرآنی۔

تزکیہ

اب آئیے عملِ تزکیہ کی جانب جس کے ضمن میں افسوس ہے کہ قرآن کی ناقدری کا معاملہ اُمّتِ مُسلمہ نے آخری حدوں تک پہنچادیا۔ ظاہر ہے کہ انسانی شخصیّت مجموعہ ہے فکر و عمل کا اور یہ دونوں لازم و ملزوم ہیں بایں معنیٰ کہ "گندم از گندم بروید، جو ز جو" کے

---

[1] سورۃ المائدہ: ۶۷ [2] بخاریؒ عن عبداللہ ابن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما

مصداق غلط فکر، غلط عمل ہی کو جنم دے سکتا ہے۔ اور صحیح عمل کے لیے تصحیحِ فکر لازمی و لابدی ہے گویا اگر کسی انسان کے فکر کی تطہیر ہو جائے اور فاسد خیالات اور غلط افکار و نظریات کو بیخ و بُن سے اکھاڑ دیا جائے تو غیر صالح اعمال اور ناقص عادات و اطوار آپ سے آپ پت جھڑ کے پتّوں کی طرح جھڑتے چلے جائیں گے، اور اگر صحیح فکر کی جڑیں ذہنِ انسانی میں راسخ ہو جائیں تو اعمالِ صالحہ اور اخلاقِ حسنہ کے برگ و بار بلا تکلّف از خود نمایاں ہو جائیں گے۔ اسی عمل (PHENOMENON) کو قرآن حکیم "وَيُكَفِّرَ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ"[1] بھی قرار دیتا ہے اور "يُبَدِّلُ اللّٰهُ سَيِّاٰتِهِمْ حَسَنٰتٍ"[2] بھی۔ اور یہی قرآنِ حکیم کا اصل فلسفۂ تزکیہ ہے یعنی یہ کہ تزکیۂ نفس کے لیے اضافی اور مصنوعی تدابیر نہ ضروری ہیں نہ مفید مطلب۔ بلکہ تزکیہ عمل لازمی نتیجہ ہے تطہیرِ فکر کا اور وہ فطری ثمرہ ہے تلاوتِ آیات کا۔ یہی وجہ ہے کہ حضراتِ ابراہیم و اسمٰعیل علیٰ نبینا و علیہما الصّلوٰۃ والسّلام نے تو اصطلاحاتِ اربعہ میں تزکیہ کا ذکر آخر میں کیا تھا لیکن قرآنِ مجید میں بقیہ تینوں مقامات پر اس کا ذکر تلاوتِ آیات کے فوراً و معاً بعد ہوا ہے!

تزکیۂ نفس کے ضمن میں ایک دوسری حقیقت بلاشبہ یہ بھی ہے کہ انسانی شخصیّت میں فکر اور عمل کے مابین ایک اور عنصر جذبات کا بھی ہے اور ویسے تو ان کی اہمیّت ہر انسان کی زندگی میں مسلّم ہے لیکن خصوصاً وہ لوگ جن کا شعور پختہ نہیں ہوتا یا جو عقلاً بالغ نہیں ہوتے اُن کی زندگیوں میں تو فیصلہ کُن اہمیّت ان ہی کو حاصل ہو جاتی ہے۔ یہی سبب ہے اس کا کہ قرآن دعوت کی اساس صرف حکمت ہی پر نہیں رکھتا موعظت پر بھی رکھتا ہے اور اپنے آپ کو موعظۂ حسنہ بھی قرار دیتا ہے اور "شِفَآءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ" بھی! —— اس پس منظر

---

[1] سورۃ الفتح : ۵ "اور تاکہ دُور کر دے اُن سے اُن کی برائیاں"!

[2] سورۃ الفرقان : ۷۰ "تبدیل کر دے گا اللہ ان کی برائیوں کو نیکیوں سے"!

میں دیکھیے کہ کس قدر افسوس ناک ہے وہ صورتِ حال جس کا نقشہ علامہ اقبالؒ نے ان اشعار میں کھینچا ہے کہ :۔ ؏

صُوفیٔ پشمینہ پوشِ حال مست ‏ ‏ ‏ از شرابِ نغمۂ قوّال مست!

آتش از شعرِ عراقی در دلش ‏ ‏ ‏ در نمی سازد بقرآں محفلش![1]

حالانکہ اگر جذبات کی جِلا اور سوز و گداز و کیف و سُرُور کی کیفیاتّ مطلوب ہوں تو اُن کا بھی سب سے بڑا منبع و سرچشمہ خود قرآن مجید ہی ہے۔ مولانا شبیرؒ احمد عثمانیؒ نے اپنے حواشی ترجمۂ قرآن میں اپنے والدِ مرحوم کے یہ حد درجہ سادہ مگر پُرتاثیر اشعار نقل کیے ہیں: ؏

سُنتے سُنتے نغمہ ہائے محفلِ بدعات کو ‏ ‏ ‏ کان بہرے ہوگئے دل بے مزہ ہونے کو ہے

آؤ سنوائیں تمہیں وہ نغمۂ مشروع بھی ‏ ‏ ‏ پارہ جس کے لحن سے طورِ ہدیٰ ہونے کو ہے

حیف گر تاثیر اُس کی تیسے دل پر پوچھ نہ ہو ‏ ‏ ‏ کوہ جس سے خاشعاً متصدّعاً ہونے کو ہے

اس ضمن میں ذرا غور فرمایئے اور داد دیجئے اس پر کہ نفسِ امّارہ کی طوفاں خیزیوں، اور ابلیسِ لعین کی وسوسہ اندازیوں سے بچنے کے لیے کس قدر صحیح مشورہ دیا ہے علاّمہ اقبالؒ مرحوم نے کہ: ؏

کشتنِ ابلیس کارے مشکل است ‏ ‏ ‏ زانکہ اُو گُم اندر اعماقِ دل است

خوشتر آں باشد مسلمانش کُنی ‏ ‏ ‏ کُشتۂ شمشیرِ قرآنش کُنی![2]

تعلیمِ کتاب آنحضورؐ کے طریقِ انقلاب میں تلاوتِ آیات اور تزکیۂ نفوس کے بعد نمبر آتا ہے "تعلیمِ کتاب" کا جو اصلاً عبارت ہے شریعتِ اسلامی کے

---

[1] اُونی لباس میں ملبوس اور اپنے حال میں مست صوفی قوّال کے نغمے کی شراب ہی سے مدہوش ہے۔ اس کے دل میں عراقی کے کسی شعر سے تو آگ سی لگ جاتی ہے لیکن اس کی محفل میں قرآن کا کہیں گذر نہیں!

[2] شیطان کو بالکل ہلاک کر دینا ایک نہایت مشکل کام ہے اس لیے کہ اس کا بسیرا نفسِ انسانی کی گہرائیوں میں ہے! بہتر صورت یہ ہے کہ اسے قرآن حکیم کی (حکمت و ہدایت) کی شمشیر سے گھائل کر کے مسلمان بنا لیا جائے!

اوامر و نواہی کی تعلیم اور احکامِ الٰہیہ کی تنفیذ سے۔ اس لیے کہ قرآن حکیم میں لفظِ کتاب کا اطلاق بالعموم شریعت کے قواعد و ضوابط پر ہوا ہے جیسے "اِنَّ الصَّلٰوۃَ کَانَتْ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ کِتٰبًا مَّوْقُوْتًا"[۱] میں یا: "وَلَا تَعْزِمُوْا عُقْدَۃَ النِّکَاحِ حَتّٰی یَبْلُغَ الْکِتٰبُ اَجَلَہٗ"[۲] میں۔ اسی طرح قرآن مجید میں کسی شے کی فرضیت و مشروعیت کے لیے بھی "کُتِبَ" کا لفظ بکثرت استعمال ہوا ہے جیسے: "کُتِبَ عَلَیْکُمُ الصِّیَامُ"[۳] ــــــ "کُتِبَ عَلَیْکُمُ الْقِتَالُ"[۴] ــــــ "کُتِبَ عَلَیْکُمْ اِذَا حَضَرَ اَحَدَکُمُ الْمَوْتُ اِنْ تَرَکَ خَیْرَا ۨ الْوَصِیَّۃُ"[۵] "رَبَّنَا لِمَ کَتَبْتَ عَلَیْنَا الْقِتَالَ"[۶]۔ "وَلَوْ اَنَّا کَتَبْنَا عَلَیْھِمْ اَنِ اقْتُلُوْٓا اَنْفُسَکُمْ"[۷]۔

واضح رہنا چاہیئے کہ تلاوتِ آیات اور تزکیے کے مراحل طے ہو جانے کے بعد ہی انسانی شخصیت کی زمین پورے طور پر تیار ہوتی ہے کہ اس میں شریعت کے اوامر و نواہی اور احکامِ الٰہی کے بیج بوئے جائیں اور وہ بِرّ و تقویٰ کی ایک لہلہاتی ہوئی کھیتی کی صورت اختیار کر لے بصورتِ دیگر فصل کا حصول درکنار بیج بھی ضائع ہو جاتا ہے۔ یہی سبب ہے اس کا کہ قرآن مجید کا 'کتاب' والا حصہ یعنی اس کی وہ آیات و سُوَر جن میں حلال و حرام کے تفصیلی احکام بیان ہوتے ہیں، اس وقت نازل ہوا جب پورے پندرہ سال کی محنتِ شاقہ کے نتیجے میں،

۱۔ سورۃ النساء: ۱۰۳ "بے شک نماز مسلمانوں پر فرض ہے اپنے مقررہ وقتوں میں"۔

۲۔ سورۃ البقرۃ: ۲۳۵ "اور نہ ارادہ کرو نکاح کا یہاں تک کہ پہنچ جائے عدّتِ مقررہ اپنی انتہا کو"۔

۳۔ سورۃ البقرۃ: ۱۸۳ "فرض کیا گیا تم پر روزہ"۔

۴۔ سورۃ البقرۃ: ۲۱۶ "فرض کی گئی تم پر لڑائی"۔

۵۔ سورۃ البقرۃ: ۱۸۰ "فرض کر دیا گیا تم پر جب حاضر ہو کسی کو تم میں موت بشرطیکہ چھوڑے کچھ مال وصیت کرنا"۔

۶۔ سورۃ النساء: ۷۷ "اور کہنے لگے اے رب ہمارے، کیوں فرض کی تو نے ہم پر لڑائی"۔

۷۔ سورۃ النساء: ۶۶ "اور اگر ہم اُن پر حکم کرتے کہ ہلاک کرو اپنی جان"۔

جس میں تمام تر توجہات تلاوتِ آیات اور تزکیے پر مرتکز رہی تھیں، ایک ایسا معاشرہ وجود میں آگیا جو ان احکام کو قبول کرنے کے لیے تیار ہی نہیں بے تاب تھا! اس کی سب سے نمایاں اور درخشاں مثال حرمتِ شراب کے معاملے میں ملتی ہے کہ اُدھر حکم نازل ہوا اِدھر شراب کے برتن توڑ ڈالے گئے اور پھر اُن لوگوں نے کبھی شراب کا خیال تک دل میں نہ آنے دیا جن کی گھُٹّی میں شراب پڑی ہوئی تھی اور پوری پوری عمریں پینے اور پلانے میں گذری تھیں۔ اور اس کے بالکل برعکس معاملہ ہوا اِس دَور میں امریکہ ایسے تعلیم یافتہ اور مہذّب و متمدّن ملک میں جہاں PROHIBITION ACT کی دھجیاں بکھر کر رہ گئیں اور ع "چھُٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی" کے آگے تمام سائنسی حقائق اور اعداد و شمار دھرے کے دھرے رہ گئے!

تعلیمِ حکمت

انقلابِ نبویؐ کے اساسی منہاج کا نقطۂ عروج (CLIMAX) ہے 'تعلیمِ حکمت'۔ ــــــ حکمت اصلاً عبارت ہے انسانی عقل اور شعور کی پختگی کی اُس سطح سے جہاں پہنچ کر احکامِ شریعت کے اَسرار و رموز واضح ہو جاتے ہیں اور اُن کی حکیمانہ غرض و غایت منکشف ہو جاتی ہے۔ گویا احکام بے جان اور زبردستی کے ساتھ ٹھونسے ہوئے اوامر و نواہی نہیں رہتے بلکہ فکر و عمل کے ایک حد درجہ حکیمانہ نظام کے ایسے باہم دگر منظم و مربُوط اجزاء کی صورت اختیار کر لیتے ہیں، جن میں نہایت حسین توازن و توافق موجود ہو۔ یاد ہو گا، یہی اصل موضوع ہے فاتح دَورِ حاضر امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی شہرۂ آفاق تالیف "حُجَّةُ اللهِ الْبَالِغَة" کا اور یہی ہے وہ جنسِ کمیاب جسے قرآنِ حکیم 'خیرِ کثیر' قرار دیتا ہے بفحوائے آیتِ قرآنی: "يُؤْتِي الْحِكْمَةَ مَنْ يَّشَاءُ ۚ وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا" [۱] (اور یہ بات بھی محض اتفاقی نہیں کہ 'خیرِ کثیر' بھی نام ہے حضرت شاہ صاحبؒ کی ایک حد درجہ پُراز حکمت تصنیف کا!) گویا حکمت کی تحصیل ہر انسان کے بس کا

---

[۱] سورۃ البقرۃ: آیت ۲۶۹

روگ نہیں، بلکہ یہ تعلیم و تربیّتِ نبویؐ کا وہ درجۂ تخصّص ہے جس سے فیض یاب صرف وہی ہو سکتے ہیں جن کے نفوس میں علم کی ایک پیاس فطری طور پر موجود ہوتی ہے۔ چنانچہ اُن کے لیے ظواہر پر اکتفا نا ممکن ہو جاتا ہے اور وہ حقائقِ باطنی کی تحقیق و تفتیش پر اسی طرح مجبور و مضطر ہو جاتے ہیں جس طرح بھوکا تحصیلِ غذا پر اور پیاسا تلاشِ آب پر ——— وَقَلِيلٌ مَّا هُمْ! اور ظاہر ہے کہ ایسے لوگ کم ہی ہوتے ہیں!

اس ضمن میں بھی اس خیال سے کہ حکمت سے لازماً قرآن کے علاوہ کوئی اور چیز مراد ہے قرآنِ حکیم کے ساتھ ایک نادانستہ اور غیر شعوری سُوءِ ظن کا امکان پیدا ہوتا ہے۔ اس لیے کہ حکمت تو قرآن کے رگ و پے میں سرایت کیے ہوتے ہے، اس لیے بھی کہ اس کی ایک مستقل صفت ہی "حکیم" ہے۔ اور اس لیے بھی کہ اُس کی شان یہ ہے کہ كِتٰبٌ اُحْكِمَتْ اٰيٰتُهٗ ثُمَّ فُصِّلَتْ مِنْ لَّدُنْ حَكِيْمٍ خَبِيْرٍ ۝[1] مزید برآں جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے۔ قرآن میں صراحتہً بھی مذکور ہے کہ: "ذٰلِكَ مِمَّآ اَوْحٰٓى اِلَيْكَ رَبُّكَ مِنَ الْحِكْمَةِ ؕ" اور اس سلسلے میں بھی حظ اُٹھایئے اور وجد میں آیئے علّامہ اقبال کے ان اشعار پر

اے کہ می نازی بہ قرآنِ حکیم! — تا کجا در حجرہ ہا باشی مقیم
در جہاں اسرارِ دیں را فاش کُن — نکتۂ شرعِ مبیں را فاش کُن

افسوس ہے کہ ہمارے اربابِ علم و فضل نے بہت کم توجہ دی قرآنِ حکیم کی ان اصطلاحاتِ اربعہ پر جو قرآن مجید میں ایک نہ دو پورے چار مرتبہ دہرائی گئیں، حالانکہ بلا سبب تکرار بظاہر کلام کا عیب شمار ہوتا ہے اور نہ قرآنِ عظیم کے مُنزِل و مُرسِل تبارک و تعالیٰ کے پاس ذخیرۂ الفاظ کی کمی تھی نہ عربی زبان کا دامن ہی اتنا تنگ تھا کہ ہر بار مختلف الفاظ نہ لائے جا سکتے۔ اس اعادہ و تکرار کا سبب ظاہر ہے کہ اس کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتا کہ اگرچہ ویسے تو قرآن مجید

---

[1] سورۂ ہود: آیت ١

کا ہر ہر لفظ غالبؔ کے اِس شعر کا مصداقِ کامل و اتمّ ہے کہ : ع

گنجینۂ معنی کا طلسم اُس کو سمجھیو　　جو لفظ کہ غالبؔ مرے اشعار میں آوے!

لیکن اِن اصطلاحاتِ اربعہ کی حیثیّت تو بالخصوص ایسی ہے کہ اِن پر توجہات کو بالکل ع "زیر ہر لفظ غالبؔ چیدہ اُم میخانہ!" کے مصداق مرتکز کر دیا جائے۔

الغرض! انقلابِ نبویؐ کے تکمیلی مراحل تو وہی ہیں جو ہر انقلاب میں پائے جانے لازمی ہیں یعنی دعوت و تنظیم، تصادم و کش مکش، ہجرت و انقطاع اور جہاد و قتال۔ لیکن اس کا اساسی منہاج مشتمل ہے تلاوتِ آیات، تزکیہ اور تعلیمِ کتاب و حکمت پر، جس کا مرکز و محور ہے قرآنِ حکیم!

اِنفرادی تبدیلی

اگر آپ کسی ایک فرد کی زندگی میں بھی یہ 'انقلاب' لانا چاہیں تو اس کے لیے ناگزیر ہے کہ پہلے آپ اس کے فکر کا جائزہ لیں اور تلاوتِ آیات کے ذریعے اس کے ذہن کو فاسد خیالات اور غلط نظریات سے اور اُس کے قلب کو فاسد ارادوں اور غلط اُمنگوں اور خواہشات سے پاک کریں۔ اُس کے فکر کی ایمان باللہ، ایمان بالآخرت اور ایمان بالرّسالت کی محکم اساسات پر از سرِ نو تعمیر کریں اور اس کے قلب کو نورِ ایمان سے منوّر کر دیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ غیر صالح اعمال اور غلط عادات و اطوار پت جھڑ کے پتوں کی طرح خود بخود جھڑ جائیں گے۔ اور تب موزوں وقت آئے گا اس کا کہ شریعت کے اوامر و نواہی کی تلقین اسے کی جائے۔ گویا اس کے وجود پر شریعت کا نفاذ عمل میں آجائے۔ پھر اگر وہ صاحبِ استعداد ہو تو ایک قدم اور آگے بڑھ کر حکمت کی تحصیل کرے جس سے اصل انشراحِ صدر اور اطمینانِ قلب بھی حاصل ہو جائے گا ——— اور اُس کی شخصیت میں اِس انقلاب کو تمکّن و استقلال بھی حاصل ہو جائے گا۔ اصل میں یہ ہے وہ محنت و مشقّت جس کا ثمرہ بیان ہوا آنحضورؐ کے اُس حکیمانہ قول میں جو آپؐ نے حضرتِ علیؓ سے خطاب کر کے فرمایا تھا کہ :

"لَاَنْ یَّھْدِیَ اللّٰہُ بِکَ رَجُلًا وَّاحِدًا خَیْرٌ لَّکَ مِنْ حُمُرِ النَّعَمِ"!
(اے علیؓ! اگر اللہ تمہارے ذریعے کسی ایک شخص کو بھی ہدایت دے دے تو یہ تمہارے لیے سُرخ اونٹوں سے بڑھ کر ہے!) اور اگر آپ اس ہفت خواں کو طے کرنے کے لیے تیار نہ ہوں تو آپ کی حالت وہی ہو گی جو ہمارے معاشرے میں ان بہت سے بڑے بوڑھوں کی ہوتی ہے جنہوں نے اپنی نوجوان نسل کو حوالے تو اُس نظامِ تعلیم کے کیا ہے جس کے بارے میں غلط نہیں کہا جس نے بھی کہا کہ ؎

یُوں قتل سے بچّوں کے وہ بدنام نہ ہوتا — افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سُوجھی
اور
گلا تو گھونٹ دیا اہلِ مدرسہ نے ترا — کہاں سے آئے صدا لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ

نتیجۃً کسی کے ذہن پر برٹرینڈ رسل سوار ہے اور کسی کے سارتر، کوئی فرائڈ کا شیدائی ہے اور کوئی یونگ یا ایڈلر یا مکڈوگل کا، کسی پر ڈارون کا جادو چلا ہوا ہے اور کسی پر ہیگل اور مارکس کا۔ چنانچہ خدا و آخرت اور وحی و رسالت پر ایمان و یقین کے آثار کا کوسوں پتہ نہیں لیکن تلقین ہو رہی ہے نماز اور روزے کی اور فرمائش و فہمائش ہو رہی ہے شعائرِ دینی کے احترام کے بارے میں، نتیجہ اس کے سوا اور کیا نکل سکتا ہے کہ نوجوان اگر نسبتاً شریف اور سعادتمند ہے تو نگاہیں نیچی کر لے اور آپ کی موجودگی میں احتراماً آپ کی خواہش بھی پوری کر دے لیکن اگر ذرا بیباک اور جری ہو تو صاف کہہ دے کہ "چھوڑیئے ابّا جان! یہ سب ڈھکوسلے ہیں، جن کی کوئی حقیقت نہیں ہے"!

اجتماعی انقلاب

اس معاملے میں انسانی معاشرہ یا انسانی ہیئتِ اجتماعیہ کا طرزِ عمل (BEHAVIOUR) بھی بالکل ایک فردِ واحد کے مانند ہوتا ہے۔ ہر معاشرے میں قوم کا ایک طبقہ وہ ہوتا ہے جسے بالعموم ذہین اقلیّت یعنی INTELLECTUAL MINORITY یا INTELLIGENTSIA یا BRAIN TRUST قرار دیا جاتا ہے اور جس کی حیثیّت جسدِ اجتماعی میں بالکل وہی ہوتی

ہے جو فردِ واحد کے جسم میں اس کے دماغ کی۔ اگر کسی معاشرے میں اسلامی انقلاب لانا مطلوب ہو تو اولاً اس کے اس طبقے کو APPEAL کرنا اور اُس کے قلوب و اذہان کو نورِ ایمانی سے منوّر کرنا، گویا اسے اسلام کے حق میں بالفعل CONVERT کرنا ناگزیر ہے۔ معاشرے یا قوم کے دوسرے طبقات کی حیثیّت اعضاء وجوارح کی ہے جو قلب وذہن کے بے دام غلام ہوتے ہیں اور اُن سے صادر ہونے والے احکام کی بے چون وچرا اطاعت کرتے ہیں۔ جو لوگ کسی معاشرے یا قوم کے اجتماعی فکر کی تطہیر اور اس کی سوچ کے دھارے کا رُخ تبدیل کیے بغیر خواہش مند ہوں کہ معاشرہ بحیثیّتِ مجموعی اسلام کو عملاً قبول کرلے، اُن کا خلوص واخلاص اپنی جگہ، اور نیک خواہشات اور تمنّائیں اپنے مقام پر، لیکن امرِ واقعہ کے اعتبار سے اُن کی حالت بھی ان نیک مگر سادہ دل لوگوں سے کسی طرح مختلف نہیں جن کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ ○

مرکزی **انجمن خدام القرآن** لاہور

کے قیام کا مقصد

منبع ایمان —— اور —— **سرچشمۂ یقین**

قرآنِ حکیم

کے **علم و حکمت** کی

وسیع پیمانے —— اور —— اعلیٰ علمی سطح

پر تشہیر و اشاعت ہے

تاکہ امتِ مسلمہ کے فہیم عناصر میں **تجدیدِ ایمان** کی ایک عمومی تحریک برپا ہو جائے

اور اس طرح

اسلام کی نشاۃِ ثانیہ — اور — **غلبۂ دینِ حق کے دورِ ثانی**

کی راہ ہموار ہو سکے

وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ